# حصے دار

## ملک صفدر حیات

(ریٹائیرڈ ڈی ایس پی)

جرم وسزا اور تفتیش کی ناقابل فراموش کہانیاں
جو انسانی حرص وہوس کا آئینہ ہیں

# حصّے دار

راوی: ملک صفدر حیات (ریٹائرڈ ڈی ایس پی)

تحریر: حسام بٹ

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور
فون: 042-37652546 , 042-37668958
www.alquraish.com E.mail:info@alquraish.com

خوب سے خوب تر کتابوں کی اشاعت
جدت اور معیار کے ساتھ

---

بااہتمام.....محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باراوّل..... 2012ء

مطبع..... نیئر اسد پریس لاہور

کمپوزنگ..... کلائمکس گرافکس

قیمت ..... -/200روپے

# فہرست


| | | |
|---|---|---|
| -1 | حصے دار | 5 |
| -2 | کھرے سکے | 47 |
| -3 | منہ کالک | 111 |
| -4 | اس کی خاطر | 168 |

5

## حصے دار

ان دنوں میں موضع ''رکھاں والی'' کے تھانے میں تعینات تھا۔ یہ گاؤں ایک نیم پختہ سڑک کے کنارے واقع تھا۔ وہ ماہِ نومبر کے ابتدائی ایام تھے۔ موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ مجھے اس تھانے میں آئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، مجھ سے پہلے والے تھانا انچارج مجید کھرل کو ہاتھ پاؤں ہلانا پسند نہیں تھا۔ میرے لیے اس تھانے میں ڈھیروں کام جمع تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور کام میں جت گیا۔

مجھے یقین ہے، قارئین بکریوں والی چاچی، مریاں کو ابھی تک بھولے نہیں ہوں گے جس نے اپنی ایک بکری کا گلا کاٹ کر اسے اپنے گھر کے برآمدے میں دفن کر رکھا تھا اور کہتی تھی، یہ اس کی بیٹی نرگس کی قبر ہے۔ بعد ازاں میں نے چاچی کی نفسیات سے کھیلتے ہوئے اے ایس آئی اعجاز حسین کی بیوی رضیہ کے تعاون سے اس پیچیدہ کیس کو حل کر دیا تھا۔ اس کیس کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ چاچی مریاں والا معاملہ ابھی زیرِ تفتیش تھا کہ مجھے ایک نئے محاذ پر الجھنا پڑ گیا تھا۔ زیرِ نظر کہانی اسی محاذ سے متعلق ہے۔

ایک روز میں دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر یہ سوچ رہا تھا کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ اسی سوچ بچار میں سہ پہر ہو گئی اور اب میں ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد پٹواری دوست محمد سے ملنے جا رہا تھا کہ مجھے اچانک اپنے پروگرام میں تبدیلی کرنا پڑی۔ یہ پٹواری دوست محمد وہی شخص تھا جس کی بدعنوان تھانے دار مجید کھرل سے بڑی گہری دوستی تھی اور.....اسی پٹواری کے بیٹے ظفر محمود نے بکریوں والی چاچی کی بیٹی نرگس کو قتل کیا تھا۔ آپ اس واقعے کی تفصیل ملاحظہ کر چکے ہیں۔

پروگرام میں تبدیلی کا باعث وہ ہنگامی اطلاع تھی جس میں ڈاکوؤں کے مسلح گروہ نے ایک برات پر حملہ کر دیا تھا۔ جائے وقوعہ سے ''فرار'' ہو کر چند افراد تھانے پہنچے اور مجھے بتایا کہ ادھر جنگل میں ایک خوفناک واردات ہوگئی ہے۔ وہ کُل چار افراد تھے۔ دلہن کا چاچا امیر بخش، دولہا کا بڑا بھائی گلزار حسین اور دو دیگر براتی، میں نے امیر بخش اور گلزار کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ تین اور چار بجے کا درمیانی وقت تھا۔ یہ ایسا واقعہ رُونما ہوا تھا کہ میں تھانے میں بیٹھ کر متاثرین کے طویل انٹرویوز نہیں کر سکتا تھا۔ صورتِ حال اس بات کی متقاضی تھی کہ میں فی الفور جائے وقوعہ پر پہنچ جاؤں تاہم فریادیوں سے ابتدائی پوچھ گچھ بھی ضروری تھی، جب ہی میں نے امیر بخش اور گلزار کو اندر بلایا تھا۔ امیر بخش کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی۔ اسی نے مجھے اس اندوہناک واقعے کے بارے میں بتایا تھا، بڑے پریشان لہجے میں اس نے کہا تھا۔ ''تھانے دار صاحب! ہم تو لٹ گئے، خانہ خراب ہوگیا ہمارا.....!''

یہ مجھے معلوم ہو چکا تھا، دونوں میں سے کسی بھی پارٹی کا تعلق موضع رکھاں والی سے نہیں تھا۔ اسی تناظر میں، میں نے امیر بخش چاچا سے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں امیر بخش، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم دماغ کو قابو میں رکھتے ہوئے مجھے بتاؤ کہ برات کہاں سے آ رہی تھی اور کہاں جا رہی تھی؟''

''جناب.....!'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''برات آج کوئی دس بجے صبح جسکانی پور پہنچی تھی۔ ہمارا تعلق جسکانی پور سے ہے۔'' پھر اس نے پہلو میں بیٹھے ہوئے شخص کی جانب اشارہ کیا اور مزید بتایا۔ ''یہ دلہا کا بڑا بھائی ہے.....گلزار۔ یہ لوگ ادھر سلطان آباد میں رہتے ہیں۔ برات کا شاندار استقبال کیا گیا، نکاح کی تقریب ہوئی، کھانا کھلانے کے بعد رخصتی ہوئی۔ ہم کوئی دو بجے کے قریب جسکانی پور سے روانہ ہوئے تھے۔ امید تھی کہ شام ہونے سے پہلے اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے لیکن راستے ہی میں.....!''

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی اور وہ خاموش ہوگیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے گلزار کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے جلدی سے بولا۔ اس کا انداز سوالیہ تھا۔

''تھانے دار صاحب! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جسکانی پور اور سلطان آباد کے بیچ جنگل پڑتا ہے.....؟''

سلطان آباد اور جسکانی پور نامی یہ دونوں گاؤں میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے اس

لیے مجھے معلوم تھا کہ تقریباً ان کے درمیان جنگل کا ایک حصہ پڑتا تھا۔ میں نے گلزار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سر کو اثباتی جنبش دی اور کہا۔ ''ہاں..... مجھے پتا ہے!''

وہ مزید بتانے لگا۔ ''جب ہم سب لوگ جنگل کے اس حصے میں پہنچے تو ڈاکوؤں کے ایک جتھے نے اچانک ہم پر حملہ کر دیا۔ ہم اس افتاد کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے لہٰذا پوری برات میں افراتفری پھیل گئی۔ ڈاکوؤں نے فائرنگ کر کے سب کو خوف زدہ کر دیا اور لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو گئے۔ انہیں اپنا کام مکمل کرنے میں دس، پندرہ منٹ لگے ہوں گے۔ اس کے بعد وہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر گھنے جنگل میں غائب ہو گئے اور.....''

.....اور ہم اس واقعے کی اطلاع دینے آپ کے پاس تھانے آ گئے ہیں۔''

''برات میں کُل کتنے افراد شامل تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''دلہا سمیت ہم کُل پچیس افراد تھے جو آج صبح آٹھ بجے سلطان آباد سے روانہ ہو کم و بیش دس بجے جسکانی پور پہنچے تھے۔'' گلزار نے جواب دیا۔ ''واپسی میں دلہن سمیت کُل پندرہ افراد ادھر سے بھی شامل ہو گئے۔ یوں سمجھیں کہ جب ڈاکوؤں نے ہم پر حملہ کیا تو ہم لگ بھگ چالیس افراد تھے۔''

''تم چاروں اطلاع دینے تھانے آئے ہو.....'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''باقی چھتیس کیا اُدھر جائے واردات پر ہی رک کر پولیس کی مدد کا انتظار کر رہے ہیں؟''

''جی ہاں..... وہ لوگ اُدھر ہی ہیں۔'' گلزار نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے.....'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم لوگ باہر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھو۔ ہم ابھی پانچ منٹ میں نکلتے ہیں۔''

وہ دونوں اٹھے اور خاموشی کے ساتھ میرے کمرے سے باہر نکل گئے۔

✠ ✠ ✠

موضع جسکانی پور، میرے تھانے یعنی موضع رکھاں والی سے لگ بھگ آدھے میل کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع تھا جبکہ سلطان آباد، جسکانی پور سے مغربی سمت میں تھا۔ یہ گاؤں ایک دوسرے سے کم و بیش آٹھ میل کی دوری پر موجود تھے۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک

جانے کے لیے ناہموار کچا راستہ مہیا تھا جس پر گھوڑے، بیل گاڑیاں اور تانگے وغیرہ آسانی سے چل سکتے تھے۔ میں جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ جہاں پر یہ ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا، وہ جنگل کا بہ نسبت کم غیر آباد حصہ تھا۔ اسے جنگل کا کنارہ بھی کہہ سکتے تھے۔ میں نے وہاں پر موجود لوگوں سے جو ابتدائی پوچھ گچھ کی اس سے حاصل ہونے والی معلومات کا خلاصہ کچھ یوں ہے.....

آج صبح سلطان آباد سے پچیس افراد پر مشتمل برات روانہ ہوئی اور دو گھنٹے کے بعد لگ بھگ دس بجے یہ لوگ دلہن کے گھر پہنچ گئے تھے۔ ان میں دلہا سمیت پندرہ مرد اور دس لڑکیاں، عورتیں شامل تھیں۔ یہ لوگ ایک تانگے، ایک بیل گاڑی اور نو گھوڑوں پر سوار ہو کر دلہن کے گاؤں میں داخل ہوئے تھے پھر واپسی میں دلہن سمیت پندرہ افراد ان کے ساتھ شامل ہو گئے جن میں سات مرد اور آٹھ لڑکیاں، عورتیں تھیں۔ ان لوگوں نے اپنی سواری کے لیے ایک تانگا اور تین گھوڑے استعمال کیے تھے۔ اس حساب سے کُل ملا کر جب ڈاکوؤں نے برات پر حملہ کیا تو اس قافلے میں دلہا دلہن سمیت بائیس مرد، اٹھارہ عورتیں، بارہ گھوڑے، دو تانگے، ایک بیل گاڑی اور اس گاڑی پر لدا جہیز وغیرہ کا سامان شامل تھا۔ دلہن والی ڈولی (پالکی) کو بھی بیل گاڑی پر ہی رکھا گیا تھا اور دلہن کا خیال رکھنے کے لیے پانچ سمجھ دار عورتیں بھی بیل گاڑی پر سوار ہو گئی تھیں۔ واضح رہے کہ مردوں کی جو کُل تعداد بائیس بیان کی گئی ہے ان میں دو کوچوان اور ایک بیل گاڑی کا ''ڈرائیور'' بھی شامل تھے۔ یہ لوگ جسکانی پور اور سلطان آباد کے وسط میں اس مقام پر پہنچے جہاں جنگل کا آخری کنارہ پڑتا تھا تو مسلح ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔

گاؤں دیہات میں اُس زمانے میں اور.....آج کل بھی، شادی بیاہ دن میں ہی ہوتے ہیں۔ عموماً سہ پہر میں رخصتی کر دی جاتی ہے تاکہ سورج غروب ہونے سے پہلے، دلہا اپنی دلہن کے ساتھ گھر پہنچ جائے۔ گاؤں میں اگر برات کو زیادہ دور جانا ہو تو کھانے کے فوراً بعد رخصتی کر دی جاتی ہے جیسا کہ اس برات کے ساتھ ہوا تھا البتہ، اگر دلہا کا گاؤں بغل میں یا نزدیک ہو تو رخصتی کے وقت کو تھوڑا آگے بڑھا دیا جاتا ہے۔

ڈاکوؤں کی کُل تعداد چھ بتائی گئی تھی۔ انہوں نے اپنے چہروں کو چھپانے کے لیے ڈھاٹے لگا رکھے تھے۔ اگر یہ واردات رات کے وقت ہوتی تو شاید انہیں اپنی شناخت چھپانے کے لیے یہ ''اہتمام'' نہ کرنا پڑتا۔ وہ گھوڑوں پر سوار اچانک ایک جانب سے نمودار ہوئے تھے اور آناً فاناً

میں انہوں نے بے فکری سے برات پر ہلّا بول دیا تھا۔

بنیادی طور پر یہ ایک لوٹ مار کی واردات معلوم ہوتی تھی لہٰذا جسمانی نقصان کم اور مالی نقصان زیادہ اٹھانا پڑا۔ ڈاکو چونکہ پوری طرح مسلح تھے اور حملے کے وقت انہوں نے ہوائی فائرنگ کر کے براتیوں کے دلوں پر دہشت بٹھانے کی کوشش بھی کی تھی۔ ایک دو افراد کو اچھا خاصا زخمی کر دیا گیا تھا جبکہ نصف درجن کو معمولی نوعیت کی چوٹیں آئی تھیں۔ ایک مزاحمتی کو ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ انہوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہوائی کے علاوہ زمینی فائرنگ بھی کی تھی جس کے نتیجے میں یہ واحد شخص زخمی ہوا تھا۔ الغرض دس سے پندرہ منٹ کے اندر ڈاکوؤں نے ہنگامی کارروائی کر کے تمام تر قیمتی سامان، طلائی زیورات اور نقدی لوٹ لی اور جس طوفانی انداز میں وہ اچانک حملہ آور ہوئے تھے اسی رفتار سے گھنے جنگل میں غائب ہو گئے۔ دلہا دلن کو کسی ڈاکو نے ہاتھ تک لگانے کی کوشش نہیں کی تھی جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک عام سی لوٹ مار کی واردات تھی۔

میں نے فوری طور پر اپنے ساتھ آئے ہوئے پولیس اہلکاروں کی ایک ٹیم تشکیل دی اور انہیں ڈاکوؤں کی تلاش میں، جنگل کے اس حصے کی جانب دوڑا دیا، جدھر ڈاکوؤں کے فرار ہونے کے بارے میں بتایا گیا تھا حالانکہ مجھے، ڈاکوؤں کے گرفت میں آنے کی زیادہ امید نہیں تھی۔ مذکورہ واردات لگ بھگ تین بجے سہ پہر کو پیش آئی تھی اور اب وقت کھسک کر پانچ کے قریب جا چکا تھا۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد یہ سوچنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ وہ لٹیرے ابھی جائے وقوعہ کے آس پاس ہی قیام پذیر ہوں گے۔ ان تک رسائی کے امکانات اگرچہ روشن نہیں تھے تاہم یہ متلاشی قانونی کارروائی بہت ضروری تھی۔ اس مختصر سی پولیس پارٹی کو جنگل کے اندرونی حصے کی جانب روانہ کرنے کے بعد میں نقصانات کے جائزے میں مصروف ہو گیا۔

ڈاکوؤں کے اس مسلح گروہ نے آناً فاناً میں بھری برات کو نقدی، زیورات اور قیمتی سامان سے خالی کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ نقصان بیل گاڑی پر لدے ہوئے ''ساز و سامان'' کو پہنچایا گیا تھا۔ علاوہ ازیں وہ بدمعاش ٹولا اس بڑے سوٹ کیس کو بھی اپنے ساتھ اٹھا لے گیا تھا جس میں دلہن کے قیمتی ملبوسات اور دیگر پہناوے رکھے گئے تھے۔ ان نتائج سے واضح ہوتا تھا کہ وہ محض لوٹ مار کی ایک سنگین واردات تھی۔ اس میں کسی دشمنی یا انتقام کا ہاتھ نہیں تھا اور یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ ڈاکوؤں کے مذکورہ مسلح گروہ کو برات کے واپسی کے پروگرام سے مکمل آگاہی حاصل تھی۔ یہ کوئی اتفاقیہ

واردات نہیں تھی۔

ڈاکوؤں کی وحشت اور زور زبردستی سے بیشتر براتی جسمانی طور پر بھی متاثر ہوئے تھے جن میں لگ بھگ نصف درجن کو معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ ایک دو ایسے زخمی تھے جنہیں مناسب مرہم پٹی کی ضرورت تھی البتہ، وہ شخص جس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی، اسے فوری طبی امداد کے لیے اسپتال بھجوانا ضروری تھا۔ گولی اس کی ران کے اندر پھنس کر رہ گئی تھی۔ اگر زیادہ دیر تک گولی گوشت کے اندر موجود رہتی تو زہر پھیلنے کے روشن امکانات تھے۔ لہٰذا میں نے دو افراد کے ساتھ اسے تانگے میں سوار کرایا اور فی الفور اسپتال کی جانب روانہ کر دیا۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا تھا کہ ڈاکوؤں کے ظلم و ستم کا نشانہ صرف براتی مرد ہی بنے تھے۔ کسی لڑکی یا عورت کو انہوں نے چھونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ اس مقام سے برات کو سلطان آباد پہنچنے کے لیے ایک گھنٹے کا وقت درکار تھا اور ان دنوں پونے چھ بجے تک مغرب کی اذان ہو جایا کرتی تھی یعنی، اگر وہ لوگ فی الفور بھی روانہ ہو جاتے تو سلطان آباد پہنچتے پہنچتے انہیں اندھیرا ہو ہی جاتا۔ لہٰذا ایک فوری خیال کے تحت میں نے لڑکی یعنی دلہن.....جس کا نام صاعقہ تھا، اس کے چاچا امیر بخش اور لڑکے دلہا جبار حسین کے باپ ستار حسین کو اپنے پاس بلایا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

''آپ لوگوں کے بیانات اور دیگر معاملات کو بعد میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس وقت سب سے اہم معاملہ تم لوگوں کی روانگی کا ہے اور یہ فیصلہ تمہی نے آپس میں باہمی صلاح مشورے سے کرنا ہے.....!''

''صلاح مشورہ.....فیصلہ.....؟'' ستار حسین نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

امیر بخش نے کہا۔ ''آپ کس فیصلے کی بات کر رہے ہیں تھانے دار صاحب؟''

''یہاں سے روانگی کا فیصلہ۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ فیصلہ کہ اس واقعے کے بعد آپ لوگوں نے سلطان آباد کی طرف سفر کرنا ہے یا پھر جسکانی پور کی جانب واپسی ہوگی؟''

''جناب! واپسی والی کوئی کہانی نہیں ہوگی۔'' ستار حسین نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے بیٹے کو بیاہ کر لے جا رہا ہوں۔ ادھر سلطان آباد میں بڑی شدت سے ہمارا انتظار ہو رہا ہو

گا۔ ہمیں چار، سوا چار بجے تک اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہیے تھا اور آدھے راستے ہی میں پانچ سے زیادہ کا وقت ہوگیا ہے۔ سلطان آباد والوں کے انتظار میں بے چینی اور تشویش بھی شامل ہوگئی ہوگی۔''

ہوسکتا ہے، سلطان آباد سے کچھ لوگ ہماری خیریت دریافت کرنے اس طرف کا رخ بھی کر چکے ہوں اور وہ لوگ اب تب میں یہاں پہنچنے والے بھی ہوں.....!''

ستار حسین کی بات میں وزن تھا۔ وہ جس بات کا خدشہ ظاہر کر رہا تھا، ویسا ہونا عین ممکن تھا۔ دلہا کے چاچا امیر بخش نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''ستار بالکل صحیح کہہ رہا ہے۔ برات کو جلد از جلد سلطان آباد کی سمت روانہ ہو جانا چاہیے۔ یہ تو کسی بھی صورت ممکن نہیں کہ برات واپس جسکانی پور لے جائی جائے۔ صاعقہ کا باپ اور میرا بڑا بھائی قدیر بخش اس دنیا میں باقی نہیں ہے۔ چند سال پہلے اس کا انتقال ہوگیا تھا۔ میں نے باپ بن کر صاعقہ کو بیاہا ہے۔ لوٹ مار کا جو واقعہ پیش آچکا، وہی کچھ کم نہیں ہے۔ اگر صاعقہ کی ڈولی واپس جائے گی تو اسے بہت ہی برا سمجھا جائے گا۔ صاعقہ اور اس کی بیمار ماں اس صدمے کو برداشت نہیں کرسکیں گے.....'' اس نے چند سیکنڈ کا توقف کر کے گردن کو نفی میں جھٹکا پھر حتمی لہجے میں بولا۔

''نہیں جناب.....اس برات کو ہر قیمت پر سلطان آباد ہی پہنچنا چاہیے!''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی پھر کہا۔ ''جب آپ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ برات کو سلطان آباد جانا چاہیے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ لوگوں کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا.....'' میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے باری باری ان دونوں کی آنکھوں میں جھانکا پھر بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

''کل کسی بھی وقت آپ لوگ میرے پاس تھانے میں آکر اپنا بیان ریکارڈ کروائیں گے۔ آپ دونوں کے ساتھ دو تین ایسے معتبر افراد بھی ہوں گے جو اس برات میں شامل ہیں اور اس افسوسناک واقعے کے چشم دید گواہ بھی ہیں۔ سرِ دست میں کسی بھی براتی کو روک نہیں رہا لیکن کل آپ کو ہر صورت میں یہ کام کرنا ہوگا!''

''ٹھیک ہے جناب۔'' امیر بخش نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم آپ

کے حکم کی تعمیل کریں گے۔''

ستار حسین بولا۔''تھانے دار صاحب! ہم کل آپس میں مشورہ کرنے کے بعد کوئی وقت طے کر لیں گے لیکن یہ ذہن میں رہے کہ وہ وقت شام کے اریب قریب ہی کا ہوگا کیونکہ.....'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا، ایک گہری سانس خارج کی اور اضافہ کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

''''تھانے دار صاحب! عزت، جان اور مال میں سب سے زیادہ اہمیت عزت کی، اس کے بعد جان کی اور سب سے آخر میں مال کی ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے، ہماری عزت اور جان محفوظ رہی ہے۔ مال و دولت اور زیورات کا کیا ہے۔ انسان زندہ رہے تو یہ چیزیں دوبارہ بن جاتی ہیں۔ اس لیے.....کل ولیمہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوگا۔ ولیمے سے فارغ ہونے کے بعد جب امیر بخش اور جسکانی پور کے دیگر لوگ واپسی کی راہ اختیار کریں گے تو میں بھی ان کے ساتھ ہی آ جاؤں گا۔ آپ کا تھانا موضع رکھاں والی میں ہے جو جسکانی پور کے بہت قریب واقع ہے۔''

میں نے ستار حسین کے پروگرام سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے انہیں جانے کی اجازت دے دی لیکن اس سے پہلے کہ وہ لوگ مقام ''لٹ پٹاں'' سے روانہ ہوتے، ستار حسین کا خدشہ سچا ثابت ہو گیا۔ سلطان آباد کی سمت سے چند گھڑ سواروں کی مخصوص آواز سنائی دینے لگی۔ وہ چار یا پانچ گھڑ سوار تھے جو اپنے گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔ ناہموار کچے راستے پر گھوڑوں کے پاؤں کی مخصوص آوازیں ابھر رہی تھیں۔

امیر بخش اور ستار حسین نے چونک کر بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر وہ سوالیہ نظروں سے مجھے تکنے لگے۔ ان کے ذہنوں میں اس وقت جس نوعیت کے خیالات ابھر رہے تھے میں اچھی طرح ان سے آگاہ تھا لہٰذا میں نے ان کی سوچ کی تائید کرتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

اگلے ہی لمحے ہم سب کے اندازوں کی تصدیق ہو گئی۔ گھڑ سوار ہماری نظروں میں آ گئے۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ قریب پہنچنے پر پتا چلا کہ ان سب کا تعلق سلطان آباد سے تھا اور وہ ان لوگوں کی خیریت دریافت کرنے ہی یہاں پہنچے تھے۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ چاروں پوری طرح مسلح تھے۔ دو نے رائفلیں سنبھال رکھی تھیں اور باقی دو کی کمر پر ریوالور والے مخصوص بیلٹ نظر آ رہے تھے۔ نہ صرف بیلٹ..... بلکہ چرمی ہولسٹرز میں سے ریوالورز کے دستے

بھی جھانک رہے تھے جس سے ان کے عزائم کی ترجمانی ہوتی تھی۔اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ ان گھڑ سواروں کو یہ اندیشہ ضرور تھا کہ اگر چار بجے تک برات سلطان آباد نہیں پہنچی تو اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ راستے میں ان کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ چکا ہے، جب ہی وہ پوری ''تیاری'' کے ساتھ ادھر آئے تھے۔

آنے والوں نے برات کی ''کیفیت'' دیکھی اور ان لوگوں کے ساتھ ایک تھانے دار کو موجود پایا تو پلک جھپکتے میں صورتِ حال ان پر واضح ہوگئی، نہایت ہی مختصر الفاظ میں، میں نے بھی انہیں تازہ ترین حالات سے آگاہ کر دیا۔ستار نے ان کا تعارف کرانا ضروری سمجھا جو گھوڑوں سے نیچے اتر آئے تھے۔

ریوالور بردار گھڑ سواروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے مجھے بتایا۔''تھانے دار صاحب! یہ جھارا اور جھورا ہیں۔چودھری سلطان کے خاص بندوں میں ان کا شمار ہوتا ہے اور یہ جو ان کے ساتھ آئے ہیں۔'' اس نے باقی دو، رائفل برداروں کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ''ان میں سے یہ پٹواری حیات اللہ کا بیٹا مشتاق عرف مشتا قا اور یہ اس کا دوست سلیم عرف سیما ہے۔''

مشتاق ایک پستہ قامت شخص تھا جبکہ سلیم کا قد لمبا تھا۔بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ دونوں دوست کبڈی کے بھی بہت اچھے کھلاڑی تھے۔میں نے ان چاروں کا تنقیدی نظر سے جائزہ لینے کے بعد ستار حسین کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ان سب جوانوں کا تعلق موضع سلطان آباد سے ہے؟''

''جی ہاں، یہ میرے ہی گاؤں کے لوگ ہیں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''کیا تم نے انہیں اپنے بیٹے کی شادی میں نہیں بلایا تھا؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔''ان میں سے کوئی برات میں شامل کیوں نہیں.....؟''

میں نے ایک خاص مقصد کے تحت یہ سوال کیا تھا۔ستار حسین نے جواب میں بتایا۔ ''جی، ان تمام لوگوں اور ان کے گھر والوں کو میں نے جبار کی شادی کی دعوت دی تھی لیکن یہ ایک اتفاق ہے کہ ان میں سے کوئی برات کے ساتھ سلطان آباد سے جسکانی پور نہ آ سکا.....''

''مشتاق اور سیما کے ساتھ اتفاق ہو سکتا ہے تھانے دار جی۔'' زبیر عرف جھارا نے گفتگو

میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ہم دونوں تو کل شام میں چودھری صاحب کے ایک ضروری کام سے کوٹ فرمان علی گئے ہوئے تھے۔'' دونوں سے اس کی مراد وہ اور منظور عرف جھورا تھی۔ ''ہم آج دوپہر کے بعد ہی وہاں سے واپس آئے ہیں، بلکہ یوں سمجھیں کہ سہ پہر میں ہماری واپسی ہوئی ہے.....'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''جب ہم سلطان آباد پہنچے تو پتا چلا کہ جبار کی برات واپس نہیں آئی۔ ادھر مشتاق اور سیما تیار کھڑے تھے تاکہ ادھر آ کر صورتِ حال کا جائزہ لے سکیں۔ یہ خبر چودھری صاحب کی حویلی میں بھی پہنچ چکی تھی کہ جبار کی برات کو واپسی میں خاصی دیر ہوگئی ہے لہٰذا چودھری صاحب نے حکم دیا کہ ہم دونوں بھی مشتاقا اور سیما کے ہمراہ جائیں اور.....ہم آ گئے۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

مشتاقا اور سیما نے برات میں عدم شمولیت کے لیے کوئی وضاحت پیش کرنا ضروری نہ جانا اور میں نے بھی اس موقع پر کوئی کرید وغیرہ کرنے کے بجائے صرف اتنا کہا۔

''کاش! تم لوگوں میں سے کوئی دو مسلح افراد بھی جبار کی برات کے ساتھ شامل ہوتے تو ڈاکوؤں کو یوں من مانی نہ کرنے کی جرأت ہوتی۔ اگر وہ براتیوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے تین فائر کرتے تو ایک آدھ گولی ادھر سے بھی چلتی۔ ہتھیار کی اپنی ایک مخصوص دہشت ہوتی ہے۔ پتا نہیں، ستار حسین نے اس جانب دھیان کیوں نہیں دیا..... کیوں ستار حسین؟''

میں نے سوالیہ نظر سے دلہا کے باپ کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ کی بات تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ہم نے یہی سوچا تھا کہ دن دن کا سفر ہے۔ اندھیرا ہونے سے پہلے ہم واپس سلطان آباد پہنچ جائیں گے اس لیے بھی اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔''

جھورا نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے اگر موقع کی کارروائی مکمل کر لی ہو تو ہمیں جانے کی اجازت دے دیں ورنہ ادھر سلطان آباد میں کھلبلی مچ جائے گی اور ممکن ہے لوگوں کا کوئی بڑا جتھا ادھر آنے کے لیے وہاں سے چل پڑے۔''

مشتاقا نے جھورا کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''جناب! برات کا جو بھی نقصان ہونا تھا، وہ تو ہو چکا۔ یہاں رک کر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جھورا نے بالکل صحیح کہا ہے۔ ہمیں فوری طور پر سلطان آباد روانہ ہو جانا چاہیے۔ آپ ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے جو بھی

کارروائی کرنا چاہیں، وہ آپ کی مرضی ہے۔ اس سلسلے میں ہم سے جو بھی تھاون چاہیے، ہم حاضر ہیں۔''

مشتاق کی بات میں وزن تھا اور ویسے بھی میں اس حوالے سے ایک حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔ نہ صرف فیصلہ کر چکا تھا بلکہ میں نے اس فیصلے سے ستار حسین اور امیر بخش کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ میں بھی ان لوگوں کے روانہ ہونے کے حق میں تھا اسی لیے اگلے روز انہیں تھانے آنے کو کہا تھا۔

میں نے چاروں مسلح افراد کی نگرانی میں دیگر براتیوں کو جنگل کے اس حصے سے کوچ کرنے کی اجازت دے دی لیکن اس سے پہلے کہ وہ لٹا پٹا قافلہ وہاں سے روانہ ہوتا، وہ پولیس پارٹی واپس آ گئی جنہیں میں نے ڈاکوؤں کی ''خیریت'' دریافت کرنے جنگل کے نسبتاً گھنے شمالی حصے کی سمت دوڑایا تھا۔ ان سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔

جیسا کہ میں توقع بھی کر رہا تھا، وہ متلاشی مشن میں ناکام و نامراد واپس لوٹے تھے۔ وہ جہاں تک بھی گئے، ڈاکوؤں کا نام و نشان دیکھنے کو نہ ملا۔ مزید آگے جانا خطرے سے خالی نہ ہوتا کیونکہ آدھے گھنٹے کے بعد سورج غروب ہو جاتا، گھنے جنگل کی تاریکی میں، ڈاکوؤں کے اس مسلح شیطانی ٹولے کو تلاش کرنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی غوطہ خور بحرِ اوقیانوس کی تہ میں اتر کر کامن پن ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہو۔

براتیوں کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہی ہو چکی تو انہوں نے وہاں مزید ایک سیکنڈ بھی رکنا ضروری نہ سمجھا۔ ان کے روانہ ہوتے ہی ہم لوگ بھی واپسی کے لیے چل پڑے۔

میں نے جن اہلکاروں کی ٹیم تشکیل دے کر ڈاکوؤں کی تلاش میں جنگل کی طرف روانہ کیا تھا وہ کل چار افراد تھے۔ آفتاب، منظور، صدیق اور فاروق۔ فاروق ان میں سینئر تھا اور میں نے اس کو ٹیم لیڈر بھی مقرر کیا تھا۔ واپسی کے سفر میں اس نے مجھ سے کہا۔

''ملک صاحب! ڈاکوؤں کی صحیح سمت کا اندازہ لگانے اور ان تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہمیں کسی کھوجی کی مدد لینا ہوگا۔ اس کے بغیر یہ مہم سر ہوتی نظر نہیں آتی۔''

''یہ نقطہ میرے ذہن میں بھی ہے فاروق!'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ کام اتنا سہل ثابت نہیں ہوگا جتنا بہ ظاہر دکھائی دیتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق یہ جنگل خاصے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔''

## 16

ہم گھوڑوں پر سوار ممکنہ تیز رفتاری سے تھانے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس کچے راستے کو جنگل کا صرف جنوبی کونا بچ کرتا تھا جہاں ڈاکوؤں نے ہلا بول کر اس برات کو بے سروسامان کر دیا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہم لوگ اس حصے سے نکل آئے تھے اور بڑی کامیابی سے تھانے کی طرف گامزن تھے۔

کانسٹیبل فاروق نے میری بات کے جواب میں کہا۔ ''جناب! آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ جنوب کی سمت کسی تلاش کی ضرورت ہے اور نہ ہی کوئی فائدہ۔ براتیوں کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق، جائے واردات سے ڈاکوؤں نے شمال کا رخ کیا ہے تو وہ یقیناً ادھر ہی گئے ہوں گے اور..... شمال میں یہ جنگل لگ بھگ دس میل کے فاصلے تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ اچھی خاصی دوری ہے مگر.....'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر متوقف ہوا پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بولا۔

''کھرا اٹھانے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نظر نہیں آتا۔ ڈاکوؤں نے اپنے چہروں کو ڈھاٹوں کے پیچھے چھپا رکھا تھا تاکہ ان کی شناخت نہ ہو سکے۔ برات میں شامل جالیس افراد میں سے کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ ان کے حلیے کیا تھے۔ اگر ڈاکوؤں تک پہنچنا ہے یا ان کے روٹ کا پتا چلانا ہے تو واحد ذریعہ کھوجی کی خدمات ہی ہو سکتی ہیں۔''

''اس بارے میں تھانے جا کر ہی کوئی لائحہ عمل بنائیں گے۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ بات جیت میں خاصی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ فاروق کا گھوڑا چونکہ میرے برابر میں دوڑ رہا تھا اس لیے ہم کوشش کر کے گفتگو کر رہے تھے۔ ''فی الحال، حتمی انداز میں کچھ بھی کہنا ممکن نہیں۔ جہاں تک ڈاکوؤں کے حلیوں وغیرہ کا تعلق ہے تو.....'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''براتیوں پر تو وہ جہنمی بلاؤں کے مانند نازل ہوئے تھے۔ انہیں خود کو بچانے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ رہی سہی کسر ڈاکوؤں کی فائرنگ نے پوری کر دی تھی۔ اس دہشت بھری فضا میں وہ ان کے حلیوں پر کیا دھیان دیتے، خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ حملہ آوروں نے اپنے چہروں کو مکمل طور پر ڈھاٹوں کے پیچھے چھپا رکھا ہو۔ بہرحال.....'' میں نے ایک مرتبہ پھر جملہ ادھورا چھوڑا۔ ایک گہری سانس خارج کی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم ڈاکوؤں کو سرے سے نظر انداز ہی کر دیں گے۔ انہیں تلاش تو کیا جائے گا اور ٹھیک ٹھاک طریقے سے تلاش کیا جائے گا لیکن کسی مضبوط پلاننگ کے بعد اور..... یہ سارا کام تھانے پہنچنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔''

اس کے بعد کانسٹیبل فاروق نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ جب ہم نے تھانے کے احاطے میں ''قدم'' رکھا تو شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ سورج غروب ہوئے گھنٹا بھر ہونے کو آیا تھا۔ چہار سُو تاریکی نے اپنا ڈیرا جما لیا تھا۔ فضا میں خنکی کا تناسب بھی بڑی تیزی سے بڑھا تھا۔

مغرب کی نماز کا وقت گزر گیا تھا۔ اب اس نماز کو عشا کی نماز کے ساتھ ملا کر ہی پڑھا جا سکتا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا اور رات کے کھانے سے انصاف کرنے لگا۔

✠ ✠ ✠

آئندہ روز، میں پٹواری دوست محمد اور اس کے بیٹے ظفر محمود کی طرف جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اے ایس آئی اعجاز حسین میرے کمرے میں آ گیا۔ میں نے چاچی مریاں کے سلسلے میں اعجاز کی بیوی رضیہ کو ایک مشن سونپ رکھا تھا۔ وہ اسی کی رپورٹ دینے آیا تھا اور وہ رپورٹ خاصی پُر جوش اور نا خوشگوار تھی، یعنی بکریوں والی چاچی کی بیٹی مرحومہ نرگس کی زندگی کا ایک سنسنی خیز گوشہ منکشف ہو گیا تھا جس کی مدد سے بالآخر میں نے وہ کیس حل کر لیا تھا۔ اس معاملے کی تفصیل قارئین ملاحظہ کر چکے ہیں لہٰذا میں اس ذکر کو لپیٹ کر ایک ڈبے میں بند کرنے کے بعد زیرِ نظر واقعے کی طرف آتا ہوں۔

چاچی بکریوں والی کے بارے میں، اعجاز حسین کو مختلف ہدایات دینے کے بعد میں نے ڈاکوؤں کی ''کارفرمائی'' کے حوالے سے اسے مختصراً آگاہ کیا پھر اس کی رائے جاننے کے لیے سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ''ملک صاحب! کھرا اٹھانے والا آئیڈیا برا تو نہیں لیکن مجھے اس کے نتائج برآمد ہوتے نظر نہیں آتے اور اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اول تو..... اگر صرف شمالی سمت ہی میں ڈاکوؤں کا کھرا اٹھانے کا کام شروع کریں تو لگ بھگ

بارہ میل تک جنگل کی خاک چھاننا پڑے گی اور مہم جوئی کا زیادہ ہی شوق ہو تو دائیں بائیں، اوپر نیچے جنگل کا کونا کونا چھانکا جا سکتا ہے۔ مگر اس کام کے لیے کم از کم ایک ہفتہ درکار ہوگا۔ اس بھاگ دوڑ کے بعد اگر یہ معلوم ہوا کہ ڈاکوؤں کا وہ گروہ جنگل عبور کر کے کہیں اور نکل گیا ہے تو ہم کیا بگاڑ لیں گے ان کا۔ اس جنگل کے شمالی کنارے پر ایک نیم پختہ سڑک ہے جو دو بڑے اضلاع کی دو تحصیلوں کو آپس میں ملانے کا کام کرتی ہے۔ مذکورہ دونوں تحصیلوں کے بیچ بھی کم از کم بیس پچیس میل کا فاصلہ ہے۔''

''میں تمہارے خیالات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں اعجاز حسین!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایک اہم پوائنٹ کو تم بھول رہے ہو۔''

''کون سا پوائنٹ ملک صاحب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ ہم پورے جنگل کا چپا چپا نہیں چھان سکتے۔ اگر ڈاکو اس جنگل میں مقیم نہیں ہیں اور ان کا مستقل ٹھکانا جنگل کے علاوہ کہیں اور ہے..... اور وہ وہاں سے نکل کر کہیں اور جا چکے ہیں تو ان تک رسائی کا عمل خاصا دشوار گزار ثابت ہو سکتا ہے۔ تم نے دو بڑی تحصیلوں اور نیم پختہ سڑک کا حوالہ تو دیا لیکن یہ بھول گئے کہ جنگل کے شمالی کنارے پر اسی نیم پختہ سڑک کی دوسری جانب ''چک سیف'' نامی ایک بڑا گاؤں واقع ہے۔ اسی طرح جنگل کے مشرقی اور مغربی کناروں پر بھی..... یا کناروں سے کچھ فاصلے پر گاؤں دیہات ہوں گے۔ ممکن ہے، لٹیروں کا وہ گروہ اس جنگل کے بیچوں بیچ کسی بھی سمت نکل گیا ہو۔ میں تو اس علاقے میں نیا ہوں۔ تم یہاں کے جغرافیے سے اچھی طرح واقف ہو گے۔ مجھے اس بارے میں کچھ بتاؤ گے؟''

''کیوں نہیں ملک صاحب.....!'' وہ جلدی سے بولا پھر چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے بتانا شروع کیا۔ ''اگر ہم جائے وقوعہ سے ناک کی سیدھ میں شمالی سمت جائیں تو جیسا کہ میں نے بتایا ہے، نیم پختہ سڑک آ جائے گی اور اس سڑک کی دوسری جانب واقعی چک سیف بھی آباد ہے لیکن اگر ہم جنگل کے دائیں بائیں کا جائزہ لینا چاہیں تو.....''

وہ تھوڑی توقف کے بعد بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اس جنگل میں لگ بھگ دو میل آگے جائیں تو بائیں جانب ایک راستہ نکلتا ہے جو جنگل سے باہر آنے کے بعد کوٹ فرمان

علی نامی ایک گاؤں تک جاتا ہے۔ جنگل کے کنارے سے کوٹ فرمان علی تک چھ میل کا فاصلہ ہوگا.....''

''کوٹ فرمان علی.....'' میں نے زیرلب دہرایا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے یہ نام پہلے بھی کہیں سنا ہے لیکن اس وقت فوری طور پر مجھے یاد نہ آ سکا۔ اے ایس آئی جنگلی راستوں کی تفصیل بتاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اسی طرح اگر جنگل میں پانچ میل آگے جانے کے بعد دائیں طرف مڑ کر سفر جاری رکھیں تو جنگل سے باہر نکل کر فرید نگر کا راستہ مل جاتا ہے۔ جنگل کے اس بیرونی مقام سے فرید نگر تک کم وبیش دو میل کا فاصلہ ہوگا اور مزے کی بات یہ ہے کہ فرید نگر ہمارے رکھاں والی سے صرف چار میل کے فاصلے پر شمال میں واقع ہے.....''

''ہوں.....!'' اے ایس آئی کے خاموش ہونے پر میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''ہمیں بڑی احتیاط کے ساتھ چک سیف، فرید نگر اور کوٹ فرمان علی نامی ان تینوں گاؤں کو چیک کرنا ہوگا لیکن اس کے ساتھ ہی جنگل والے معاملے کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا.....!''

میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو اعجاز حسین سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ڈاکوؤں کا وہ بدمعاش ٹولا براتیوں اور دلہا دلہن کی نقدی وزیورات کے علاوہ وہ سوٹ کیس بھی اٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا ہے جس میں دلہن کے ملبوسات اور دیگر استعمال کی قیمتی اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ دلہن کے ایک دو طلائی زیورات بھی اس سوٹ کیس میں موجود تھے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ڈاکو اس سوٹ کیس کو اٹھائے ہوئے اپنے ساتھ زیادہ دور تک نہیں گئے ہوں گے۔ ڈاکو اور چور وزنی اور بڑے سائز کی اشیا سے جلد جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ یہی اشیا ان کے لیے اکثر پریشانی کا سبب بن جاتی ہیں۔ ان کی مدد سے ان کی شناخت ہو جاتی ہے لہٰذا مجھے قوی امید ہے کہ ڈاکوؤں نے جنگل کے کسی مقام پر مذکورہ سوٹ کیس کو کھول کر اس کے اندرون کا جائزہ لیا ہوگا اور ''کام'' کی چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد وہ اس سوٹ کیس کو جنگل ہی میں کہیں پھینک گئے ہوں گے۔ ہم اگر مذکورہ سوٹ کیس کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہمیں ڈاکوؤں کے فرار کی سمت کا تعین کرنے میں کافی آسانی رہے گی۔ تمہارا کیا

خیال ہے اعجاز حسین؟''

آخری جملہ میں نے اے ایس آئی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ جلدی سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے تائیدی انداز میں بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب! ہمیں ڈاکوؤں کی تلاش کا آغاز جنگل ہی سے کرنا ہوگا اور اگر خوش قسمتی سے وہ سوٹ کیس ہمیں مل جاتا ہے تو پھر اسی مقام سے کھرا اٹھا کر ڈاکوؤں کے فرار کی سمت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔''

''کھوجی کو تو شروع ہی سے ساتھ رکھنا ہوگا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ورنہ مذکورہ سوٹ کیس کے متوقع مقام تک پہنچنا بہت دشوار ثابت ہوگا۔''

''اس علاقے میں ایک بہت ہی تجربہ کار کھوجی رہتا ہے ملک صاحب!'' اعجاز حسین نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔ ''اس کا نام اللہ دتا ہے۔ اللہ دتا کی عمر ساٹھ سے اوپر ہو چکی ہے لیکن ابھی تک نظر کا چشمہ لگائے بغیر قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے۔ نگاہ ایسی تیز ہے کہ کھرا اٹھانے میں اسے کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور سب سے اہم بات یہ کہ.....'' وہ لمحے بھر کے لیے سانس لینے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''.....کہ بابا دتا پر موسم کی سختی اثر انداز نہیں ہوتی۔ شدید تیز سردی ہو یا روح فنا کر دینے والی گرمی، وہ ہر موسم میں ایک ہی لباس میں ملبوس دکھائی دیتا ہے۔ ململ کا کرتہ، لٹھے کی دھوتی (تہ بند) اور ململ ہی کا صافہ (پگڑی)۔ کسی نے کبھی اسے یہ شکوا کرتے دیکھا نہ سنا کہ..... ہائے، آج تو قیامت کی گرمی ہے۔ اف اللہ، آج کتنی سردی ہے!''

''ایسا نابغہ موضع رکھاں والی میں موجود ہے اور تم نے مجھے پہلے نہیں بتایا۔'' میں نے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''تم فوراً اسے یہاں بلاؤ تاکہ ڈاکوؤں کی تلاش میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہو۔''

''آپ کے حکم کی دیر تھی ملک صاحب۔'' وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ ''میں ابھی اسے یہاں بلواتا ہوں۔''

اگلے ہی لمحے اعجاز حسین میرے کمرے سے نکل گیا۔

میں نے سینئر کانسٹیبل فاروق کو اپنے پاس بلا لیا۔ گزشتہ روز سہ پہر میں فاروق کی زبر

نگرانی میں نے ایک مختصر سی پولیس پارٹی ڈاکوؤں کے تعاقب میں جنگل کی جانب روانہ کی تھی جو حسب توقع ناکام و نامراد واپس لوٹے تھے۔ میں فاروق سے جنگل کا احوال معلوم کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ میرے کمرے میں موجود تھا۔ ابتدائی پوچھ گچھ تو میں اس سے پہلے ہی کر چکا تھا۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ چکا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''فاروق! تم لوگ گزشتہ روز جنگل کے اندر جہاں تک بھی گئے اس راستے میں تمہیں کسی جگہ کوئی سوٹ کیس وغیرہ پڑا تو دکھائی نہیں دیا تھا؟''

''کیسا سوٹ کیس ملک صاحب!'' وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے اسے بتایا۔ ''ایک ایسا سوٹ کیس جس کی تیاری میں ریگزین استعمال کیا گیا ہو۔ اس ریگزین کا گراؤنڈ گرے کلر اور اس پر ریڈ کلر کا چیک بنا ہو۔ اس کے ساتھ ہی چیک کی بلیک پٹیاں بھی ہوں یعنی ریگزین کی گرے گراؤنڈ پر ریڈ اینڈ بلیک چیک پرنٹ ہو.....؟''

امیر بخش اور ستار حسین کی زبانی، اس سوٹ کیس کے بارے میں مجھے صرف اتنی سی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ فاروق نے چند لمحات تک سوچنے کے بعد نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔

''نہیں ملک صاحب.....ایسا سوٹ کیس تو مجھے کہیں نظر نہیں آیا.....ایسا کیا، کسی بھی طرح کا سوٹ کیس جنگل میں پڑا دکھائی نہیں دیا۔''

''تم لوگوں نے زیادہ تر سفر کس سمت میں کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم جائے وقوعہ سے سیدھے شمالی سمت میں گئے تھے جیسا کہ براتیوں نے ڈاکوؤں کے فرار کے حوالے سے نشان دہی کی تھی۔'' فاروق نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔ ''ایک ہی رخ میں آگے بڑھتے ہوئے ہم اپنے دائیں بائیں بھی نظر دوڑاتے جا رہے تھے لیکن اس راستے میں سوائے گھنے درختوں کے ایسا کچھ بھی دکھائی نہیں دیا جسے قابل ذکر سمجھا جا سکے۔''

تھوڑی دیر پہلے اے ایس آئی اعجاز حسین سے ہونے والی گفتگو میرے ذہن میں تازہ تھی۔ اسی کی روشنی میں، میں نے فاروق سے سوال کیا۔ ''یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم لوگوں نے جنگل کے مشرقی اور مغربی حصوں کا بالکل رخ نہیں کیا؟''

''جی ہاں.....حقیقت یہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں مزید چند منٹ تک فاروق سے بات چیت کرتا رہا۔ ہمارے موضوع کا مرکز ومحور ڈاکو اور جنگل ہی تھا۔ میں نے اسے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں بھی بتایا کہ میں نے کس طرح کھوجی اللہ دتا کی مدد سے ڈاکوؤں تک رسائی حاصل کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس نے بھی کھوجی اللہ دتا کی تعریف کی اور فرمائشی انداز میں مجھ سے کہا۔

''ملک صاحب! میری یہ خواہش ہے کہ اس مشن میں آپ مجھے اپنے ساتھ رکھیں جیسا کہ بکریوں والی چاچی کے کیس میں اے ایس آئی صاحب آپ کا ساتھ دے رہے ہیں!'' فاروق کا اشارہ اے ایس آئی اعجاز حسین کی جانب تھا۔ میں نے اس کی تمنا پوری کرتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے فاروق، اس مشن میں، میں تمہیں اپنے ہمراہ لے کر جاؤں گا۔''

وہ تشکرانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بہت بہت شکریہ ملک صاحب!''

تھوڑی دیر کے بعد اعجاز حسین میرے پاس آیا اور آ کر مجھے اپنی کارکردگی کے بارے میں مطلع کرنے لگا۔ ''ملک صاحب! اللہ دتا اس وقت رکھاں والی میں موجود نہیں۔ اس کے گھر سے پتا چلا ہے کہ وہ دوپہر سے پہلے واپس آ جائے گا۔ میں نے اس کے گھر والوں کو تاکید کر دی ہے کہ وہ جیسے ہی آئے، اسے تھانے بھیج دیا جائے۔''

''یہ تم نے بہت اچھا کیا اعجاز حسین!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جب تک میں چاچی مریاں کی ''خیر خبر'' لے کر آتا ہوں!''

اعجاز حسین نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

آئندہ دس منٹ میں، میں نے اعجاز کو اپنے اور فاروق کے پروگرام سے متعلق آگاہ کیا اور بتایا کہ ہم کھوجی اللہ دتا کی مدد سے کس طرح ڈاکوؤں کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے۔

وہ پوری توجہ سے میری بات سنتا رہا اور اس دوران میں وقفے وقفے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش بھی دیتا رہا۔ اپنی بات کے اختتام میں، میں نے اس سے کہا۔ ''اعجاز حسین! موسم سرما نے اپنے قدم جمانا شروع کر دیے ہیں اور دوپہر کے بعد کا وقت تو نہایت ہی تیز رفتاری سے گزرتا ہے۔ آج جب ہم جنگل کا رخ کریں گے تو مجھے انہیں امید کہ ایک ہی دن میں یہ کام مکمل ہو سکے۔ ہو سکتا ہے، ہمیں کوئی تسلی بخش نتیجہ حاصل کرنے کے لیے دو چار دن لگ جائیں۔ باقی دنوں کا

پروگرام تو بعد میں بنائیں گے لیکن آج کے لیے..... آج کے لیے تمہیں بہت ہوشیار اور محتاط رہنا ہوگا.....!''

''میں کچھ سمجھا نہیں ملک صاحب؟'' وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی الجھن دور کرتے ہوئے کہا۔''میں نے دلہا کے باپ ستار حسین اور دلہن کے چاچا امیر بخش کو چند معتبر براتیوں کے ہمراہ آج تھانے بلا رکھا ہے تا کہ ان کے باقاعدہ بیانات قلم بند کیے جاسکیں۔ستار حسین نے بڑے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ وہ لوگ سہ پہر اور شام کے بیچ کسی وقت تھانے پہنچ جائیں گے اور میرے نئے پروگرام کے مطابق، ان اوقات میں، میں تھانے کی عمارت سے پانچ چھ میل دور گھنے جنگل میں مصروف رہوں گا لہٰذا.....'' میں نے ایک مرتبہ پھر لمحاتی توقف کیا۔اس کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''لہٰذا اس دوران میں تمہیں تھانے کے اندر نہایت ہی مستعد رہنا ہوگا۔تھانے کے دیگر معاملات کو ہینڈل کرنے کے علاوہ تمہیں، ڈاکوؤں کی کارروائی سے متاثر ہونے والے لوگوں کے بیانات بھی لینا ہوں گے!''

''آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب۔'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔''میں آپ کی غیر موجودگی میں یہاں کے معاملات کو بڑی خوبی سے سنبھال لوں گا۔آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''شاباش اعجاز.....!'' میں نے توصیفی انداز میں کہا۔''مجھے تم سے یہی امید تھی۔''

''کھرل صاحب تو جناب..... کسی کام میں گھسنے ہی نہیں دیتے تھے۔'' اس کا واضح اشارہ سابق تھانا انچارج مجید کھرل کی جانب تھا۔''سب کچھ انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔تھانے کے عملے کو وہ بس ہرکاروں اور پیادوں کے مانند دوڑاتے رہتے تھے۔''

''اعجاز حسین!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''کسی بھی بساط پر تم پیادوں کو اتنا سمجھو۔ان کا اپنا ایک خاص کردار ہوتا ہے۔بھاگ دوڑ تو ان کا مقدر ہوتی ہی ہے لیکن ڈی میں رکھا ہوا دماغ اگر ٹھیک ٹھیک کام کر رہا ہو تو انہی پیادوں کی چالوں سے ل جاتا ہے۔''

!'' وہ خاصے تلخ لہجے میں بولا۔''کھرل صاحب کی گردن کے آخری

سرے پر کھوپڑی اور کھوپڑی کے اندر دماغ تو موجود تھا لیکن وہ دماغ صرف اپنی آن بان اور فائدے کے حوالے ہی سے چالیں چلتا تھا۔ اپنے تھانے کی ساکھ اور عملے کی کارکردگی سے انہیں کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی وہ کسی کو ہاتھ پاؤں اور دماغ ہلانے کا موقع دیتے تھے.....''

''مجید کھرل صاحب مجھ سے پہلے اس تھانے میں کیا کرتے رہے تھے، اس بحث میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں اعجاز حسین!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن میرا یہ تم سے..... بلکہ اس تھانے کے پورے عملے سے وعدہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی سطح پر صلاحیتیں آزمانے کا بھرپور موقع فراہم کروں گا۔ میرے اس عہد کی مثال تو تم خود بھی ہو.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''بکریوں والی چاچی کے کیس میں، میں نے نہ صرف تمہیں بلکہ تمہاری گھر والی رضیہ کو بھی ایک اہم مہم پر لگا رکھا ہے..... ہیں نا؟''

اعجاز حسین نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

کانسٹیبل فاروق نے سوالیہ نظر سے باری باری مجھے اور اے ایس آئی کو دیکھا۔ رضیہ کے ذکر نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ رضیہ کے ذریعے، بکریوں والی چاچی اور اس کی بیٹی نرگس کے معاملے کا کھوج لگانے والی بات صرف میرے اور اعجاز حسین کے درمیان ہی تھی لہٰذا فاروق کے ''کان کھڑے'' ہونا بے سبب نہیں تھا تاہم یہ اچھا ہوا کہ اس حوالے سے اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔

میں ان لوگوں کو تھانے میں چھوڑ کر چاچی مریاں کی طرف چلا گیا۔

✠ ✠ ✠

کھوجی اللہ دتا کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی تاہم وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط اور چاق و تھا۔ رنگت گہری سانولی اور آنکھوں میں کبوتر کے خون جیسی سرخی، اس کے سر اور ڈاڑھ مکمل طور پر سفید ہو چکے تھے۔ ڈاڑھی نہایت ہی مختصر تھی جو قلموں سے ایک باریک شروع ہو کر ٹھوڑی تک پہنچتی تھی۔ گالوں پر برائے نام اور ٹھوڑی پر گنتی کے بال دراز قامت اللہ دتا کی ڈاڑھی مختصر اور نوک دار تھی۔ اس نے اعجاز حسین کے

سفید کرتہ اور لٹھے کا تہ بند باندھ رکھا تھا۔ سر پر بھی ململ کی مختصر سی پگڑی دکھائی دیتی تھی۔ پاؤں میں کچے چمڑے کا جوتا تھا۔

وہ دوپہر کے وقت تھانے پہنچ گیا تھا۔ اس وقت تک میں بھی چاچی بکریوں والی کی نفسیات سے کھیل کر اور اس کی زبان سے سچ اگلوانے کے بعد واپس آ چکا تھا لہٰذا اللہ دتا سے مختصر سی گفتگو کے بعد ہم نے جنگل کی جانب روانگی کا فیصلہ کر لیا۔ اس مشن میں کھوجی اللہ دتا کے علاوہ کانسٹیبل فاروق میرے ہمراہ تھا۔

اللہ دتا نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ملک صاحب! چونکہ کھرا اٹھانے کی ابتدا ہے اس لیے میں یہ کام اسی مقام سے شروع کروں گا جہاں لوٹ مار کا یہ واقعہ پیش آیا ہے ورنہ جنگل کے اندر گھسنے کا ایک اور آسان اور مختصر راستہ بھی ہے۔''

اعجاز حسین نے مجھے بتایا تھا کہ اللہ دتا گردونواح کے تمام علاقوں کا حافظ ہے اور مذکورہ جنگل بھی انہی علاقوں میں شامل تھا۔ میں نے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے فوراً خیال آرائی کی۔

''تمہارا مطلب ہے، فرید نگر کی جانب سے.....؟''

''آپ کا اندازہ بڑی حد تک درست ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں عام لوگوں کے سفری راستے کی بات نہیں کر رہا.....'' وہ لمحے بھر کو گہری سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔

''جائے واردات تک پہنچنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے رکھاں والی کے جنوب مغرب میں لگ بھگ آدھا میل سفر کر کے جسکانی پور پہنچنا ہوگا اور پھر جسکانی پور سے کم از کم چار میل آگے جنگل کے اس جنوبی کونے میں جہاں لوٹ مار کا یہ واقعہ پیش آیا ہے جبکہ.....'' وہ ایک مرتبہ پھر رکا، ایک بوجھل سانس خارج کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جبکہ.....! اگر ہم رکھاں والی سے، عام مسافروں والے راستے پر شمال میں سفر کرتے ہوئے فرید نگر پہنچیں تو یہ فاصلہ چار میل ہوگا اور فرید نگر سے دو میل کے فاصلے پر مغرب میں جنگل شروع ہو جاتا ہے لیکن اگر میرے بتائے ہوئے راستے پر رکھاں والی سے شمال مغرب کی سمت سفر کریں تو زیادہ سے زیادہ چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم جنگل کے مشرقی کنارے کو چھو لیں

گے۔''

''لیکن.....'' اللہ دتا کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''مسئلہ وہی ہے کہ ہمیں تفتیش کا آغاز جائے وقوعہ ہی سے کرنا ہوگا..... ہیں نا؟''

''جی.....آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

''ویسے تمہاری فراہم کردہ معلومات اور تمہارے مشاہدے و تجربے کو میں قدم قدم پر استعمال کروں گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے، کھرا اٹھانے کے اس عمل کے دوران میں، کسی مرحلے پر ہمیں اس روٹ کو بھی استعمال اور اختیار کرنا پڑ جائے، جس کا ذکر ابھی تم نے کیا ہے!''

''جی ہاں۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں گردن ہلائی۔ ''ایسا ممکن ہے.....''

تین افراد پر مشتمل ہمارا یہ مختصر سا قافلہ گھوڑوں پر سوار ہو کر جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہوگیا۔ ہمارے پاس کُل دو گھوڑے تھے۔ ایک پر میں سوار تھا اور دوسرے گھوڑے پر اللہ دتا اور فاروق۔ میرے ذہن میں یہ بات کسی پھانس کے مانند چبھ رہی تھی کہ ہمارے پاس صرف آدھا دن بچا ہے۔ رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے ہمیں کھوج کا زیادہ سے زیادہ کام نمٹانا ہوگا۔ تاریکی چھا جانے کے بعد ظاہر ہے، اس کام کو جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔

اس سوچ کے پیشِ نظر ہم نے ممکنہ حد تک تیز رفتاری سے گھوڑے دوڑائے اور لگ بھگ ڈیڑھ بجے دوپہر ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں گزشتہ روز چھ ڈاکوؤں کے گروہ نے ایک مذموم کارروائی کر کے بھری پُری برات کو لوٹ لیا تھا۔ کھوجی اللہ دتا کو میں چونکہ پہلے ہی ساری تفصیل سے آگاہ کر چکا تھا لہٰذا اس نے واردات کے مقام پر پہنچتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔

اللہ دتا چونکہ ایک تجربہ کار اور ماہر کھوجی تھا لہٰذا اس نے کھوجتی ہوئی نظر سے جائے وقوعہ کا جائزہ لیا اور صرف پانچ منٹ کی تکنیکی چارہ جوئی کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ چھ گھڑ سواروں نے جائے واردات سے شمال کی جانب رخ کیا تھا۔ یہ بات تو ہمارے علم میں تھی لیکن میری اور اللہ دتا کی جان کاری میں ایک بڑا واضح فرق تھا۔

میرے پاس براتیوں کی فراہم کردہ معلومات تھیں جبکہ کھوجی اللہ دتا نے جائے وقوعہ کی زمین کا جائزہ لینے کے بعد یہ فتویٰ صادر کیا تھا کہ چھ گھڑ سوار جنگل کی شمالی سمت میں گئے تھے۔

الغرض.....کھوجی اللہ دتا کی تقلید میں ہم دونوں بھی آگے بڑھنے لگے۔اس دوران میں میرے اور فاروق کے بیچ باہمی گفتگو بھی جاری تھی البتہ اللہ دتا اس بات چیت میں بالکل حصہ نہیں لے رہا تھا۔ وہ بڑے انہماک سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہ وقفے وقفے سے بڑے ماہرانہ انداز میں جنگل کی زمین کا جائزہ لیتا، معنی خیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دیتا اور آگے بڑھ جاتا۔اس کی حرکات وسکنات میں ایک خاص قسم کا ولولہ اور عزم پایا جاتا تھا جیسے وہ ڈاکوؤں کا کھرا نہ نکال رہا ہو بلکہ ''کے ٹو'' کی چوٹی سر کرنے میں مصروف ہو.....!

ہم نے زیادہ تر پیدل اور بیچ بیچ میں گھوڑوں پر بھی سواری کی۔ دن کے تین بجے تو میرے اندازے کے مطابق ہم کوئی دو میل تک جنگل میں آ چکے تھے۔اللہ دتا گاہے بہ گاہے مجھے اپنی کارکردگی سے بھی آگاہ کرتا جا رہا تھا۔اس نے ابتدا ہی میں مجھے بتا دیا تھا کہ شمال کی جانب سفر کرنے والے کُل دس گھوڑوں کا کھرا ملا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان میں چار وہ گھڑ سوار ہوں گے جنہیں میں نے ڈاکوؤں کے تعاقب میں جنگل کی سمت دوڑایا تھا اسی لیے جب اللہ دتا ایک مقام پر رک کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا تو میں اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''کیا ہوا اللہ دتا.....کیا کوئی خاص بات ہے؟''

''ہاں جی.....''اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔''بات تو خاص ہی ہے جناب۔''اتنا کہہ کر وہ گھٹنوں کے بل جھکا اور بغور اس زمین کا جائزہ لینے لگا، میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''بات کیا ہے اللہ دتا؟''

وہ سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔''ملک صاحب! ہم پچھلے دو گھنٹوں سے گھوڑوں کے جس کھرے کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں، اس مقام سے ان کی دو ٹولیاں بن گئی ہیں۔''اس نے بات کے اختتام پر زمین کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے قدرے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔''دو ٹولیوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

اس نے جنگل کی مغربی جانب، یعنی جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔''چھ گھڑ سوار یہاں سے اس رخ کو مڑے ہیں جبکہ باقیوں کا کھرا بتاتا ہے کہ وہ بہ دستور شمال کی سمت گئے ہیں۔اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے.....''وہ لمحے بھر کے لیے متوقف

ہوا پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''یہاں سے سیدھا آگے جانا ہے یا جنگل کے مغربی حصے میں چھ گھڑ سواوں کے کھرے کا تعاقب کرنا ہے؟''

جن گھوڑوں کا کھرا سیدھا شمال کی جانب گیا تھا وہ یقیناً میری بھیجی ہوئی پولیس پارٹی ہی کے افراد تھے لہٰذا ان کے تعاقب کی کوئی تک نہیں بنتی تھی البتہ، چھ گھڑ سواروں کا کھرا میری دلچسپی کا باعث تھا۔ ان لمحات میں میرے ذہن میں جنگل کے اندرون کے حوالے سے وہ گفتگو گھوم رہی تھی جو آج صبح میرے اور اے ایس آئی اعجاز حسین کے بیچ ہوئی تھی۔ میں نے اسی کی روشنی میں اللہ دتا سے تصدیقی انداز میں پوچھا۔

''تم تو اس جنگل اور اس کے گردونواح کے چپے چپے سے واقف ہو؟''

''جی ہاں ملک صاحب.....!'' اس نے بڑی رسان سے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اگر ہم یہاں سے چھ گھڑ سواروں کے تعاقب میں بائیں جانب یعنی جنگل کے مغربی حصے کی طرف بڑھتے ہیں تو لگ بھگ پانچ میل کے بعد یہ جنگل ختم ہو جائے گا۔ اگر میں غلط نہیں سوچ رہا تو جنگل کے اختتام سے ایک سیدھا راستہ کوٹ فرمان علی کی طرف جاتا ہے..... ہیں نا؟''

''آپ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ تصدیقی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جنگل کے مغربی کنارے سے کوٹ فرمان علی کا فاصلہ کوئی چھ میل ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ہم بائیں جانب مڑ رہے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے، یہ انہی چھ ڈاکوؤں کا کھرا ہے جنہوں نے گزشتہ روز برات پر بلا بول کر لوٹ مار مچائی تھی۔''

اللہ دتا نے اتفاق کرنے والے انداز میں گردن کو حرکت دی اور ہم بائیں طرف مڑ کر جنگل میں آگے بڑھنے لگے۔ میں نے کھوجی سے پوچھا۔ ''اللہ دتا! جیسا کہ تم نے بتایا کہ یہاں سے جنگل کے مغربی کنارے تک کم وبیش پانچ میل کا فاصلہ ہے۔ اس وقت سہ پہر کے تین بجے ہیں۔ تمہارے اندازے کے مطابق ہم کتنے بجے تک جنگل سے باہر نکل جائیں گے؟''

''دیکھیں جی.....'' وہ مربیانہ لہجے میں بولا۔ ''اگر ہم لوگ باقاعدہ کسی راستے پر سفر کر

رہے ہوں اور درمیان کہیں رکیں بھی نہیں تو ہمیں یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں طے کر لینا چاہیے لیکن یہاں صورتِ حال مختلف ہے.....'' وہ رکا، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''ایک تو جنگل کے اندر کوئی باقاعدہ راستہ نہیں بنا ہوا، دوسرے ہم رک رک کر آگے بڑھ رہے ہیں لہٰذا ایک محتاط اندازے کے مطابق ہمیں اس جانب جنگل کے دوسرے کنارے تک پہنچنے میں ساڑھے تین گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگ سکتا ہے۔''

''یعنی جب ہم جنگل سے باہر نکلیں گے تو رات کے ساڑھے چھ، سات بج چکے ہوں گے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اللہ دتا کی جانب دیکھا۔

''میرے خیال میں، ہم آٹھ بجے سے پہلے جنگل کو نہیں چھوڑ سکیں گے۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''میں نے وقت اور فاصلے کا جو حساب ابھی آپ کو بتایا ہے وہ دن اور روشنی سے مشروط ہے۔ اس وقت تین بج چکے ہیں اور آج کل پونے چھ بجے سورج غروب ہو جاتا ہے۔ ہمیں اس نقطے کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ تاریکی چھا جانے کے بعد ہمارے سفر کی رفتار اور سمت کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی ممکن ہے، ہم راہ بھٹک کر کہیں کے کہیں نکل جائیں اور میرا آٹھ بجے کا بتایا ہوا وقت بھی غلط ثابت ہو جائے.....!''

اللہ دتا کی بیان کردہ باتیں اگرچہ خاصی خطرناک تھیں تاہم میں انہیں پُر از حقیقت سمجھتا تھا۔ وہ کچھ بھی غلط نہیں کہہ رہا تھا میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

''اللہ دتا! تم اپنا کام جاری رکھو۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

ایک مرتبہ پھر ہمارا کھوج بھرا سفر شروع ہو گیا۔ تھوڑا آگے آنے کے بعد کانسٹیبل فاروق نے اطلاع دینے والے انداز میں مجھ سے کہا۔ ''ملک صاحب! ہم ڈیڑھ بجے جائے وقوعہ پر پہنچے تھے۔ وہاں سے یہاں تک پہنچنے میں ہمیں ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا ہے.....!''

''ہاں ہاں، مجھے پتا ہے۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''تم مجھے کیا بتانے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''جناب! آپ میرے افسر ہیں اور مجھ سے زیادہ سمجھدار بھی ہیں.....!''

''ایک منٹ فاروق!'' میں نے ایک مرتبہ پھر قطع کلامی کی اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

''عقل اور سمجھ کا تعلق افسری اور ماتحتی سے نہیں بلکہ یہ دماغ کی کارکردگی پر منحصر ہے۔ انسان بنیادی طور پر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک عاقل اور سمجھ دار انسان منفی سوچ کے زیر اثر ہلاکت خیز تخریبی کارنامے انجام دے سکتا ہے جبکہ مثبت سوچ کا حامل انسان ہمیشہ تعمیری اور انسانیت کی بھلائی کے حوالے ہی سے منصوبہ بندی کرے گا۔''

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!'' میرے خاموش ہونے پر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دراصل آپ عمر، عہدے اور تجربے میں مجھ سے سینئر ہیں نا اس لیے میں نے کہا تھا کہ آپ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ میں درحقیقت آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ .....ہمیں کھوج کے سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے اس بات کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ یہ رات ہمیں جنگل میں نہیں گزارنی.....رات کی تاریکی پھیلنے سے پہلے ہمیں جنگل سے باہر نکلنا ہوگا۔''

''تمہارے ذہن میں بہت اچھا پوائنٹ آیا ہے فاروق!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں اس نقطے کو بھولے بیٹھا ہوں۔ میں نے ایک ایک منٹ کا حساب رکھا ہوا ہے۔ ساڑھے بارہ بجے ہم نے تھانا چھوڑا اور پونے ایک بجے ہم جسکانی پور کے نزدیک سے گزر رہے تھے پھر جیسا کہ تم نے دیکھا، ڈیڑھ بجے ہم جائے وقوعہ پر پہنچ چکے تھے لیکن یہاں سے ہماری رفتار لگ بھگ پیادوں جیسی ہوگئی اور اب سہ پہر کے تین سے کچھ وقت آگے بڑھ چکا ہے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ چار، سوا چار بجے تک آگے بڑھنا ہے پھر وہاں کوئی پکی نشانی لگا کر ہم واپسی کا سفر اختیار کریں گے۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

''واپسی کے سفر میں چونکہ ہمیں کسی کا کھرا اور نہیں اٹھانا ہوگا لہٰذا یہ سفر نسبتاً تیز رفتاری سے طے ہوگا اور ہم لگ بھگ چار گھنٹے کے کھوجی سفر کو محض ڈیڑھ، پونے دو گھنٹے میں طے کر کے جائے وقوعہ پر پہنچ جائیں گے۔ میرے اندازے کے مطابق، جب ہم جائے واردات پر پہنچیں گے تو رات کا آغاز ہو چکا ہوگا یعنی کم وبیش چھ سوا چھ بجے ہوں گے۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر وقفہ دیا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''پھر پونے سات بجے جسکانی پور میں اور پورے سات تھانے کی چار دیواری میں قدم رکھنے کے بعد بجیں گے۔ ہم ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھائیں گے۔ عشا کی نماز ادا کریں گے اور مزے سے سو جائیں گے۔ اگلے روز صبح ہی سے جنگل کا رخ کریں گے اور اس مرتبہ ہم اللہ دتا کے بنائے

ہوئے راستے سے جنگل میں داخل ہوں گے کیونکہ ہماری تفتیش کا ایک رخ متعین ہو چکا ہے۔ ہم آج تک کی کارکردگی سے اپنے نئے سفر کا آغاز کریں گے اور چل سو چل.....''

کانسٹیبل آنکھیں پھاڑ کر ہکا بکا میری صورت دیکھے جا رہا تھا۔ میں خاموش ہوا تو اسے ہوش آ گیا، بڑی تیزی سے پلکیں جھپکانے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ملک صاحب! آپ اتنے اعتماد سے کس طرح باتیں کر لیتے ہیں؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

''مطلب یہ کہ.....'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ نے کھٹا کھٹ انگلیوں پر اگلے چوبیس گھنٹے کا شیڈول گنوا دیا ہے جیسے یہ سب کچھ آپ کی نوکِ زبان پر رکھا ہو۔ آپ کے لہجے سے جو اعتماد جھلکتا ہے، اس سے یقین سا ہونے لگتا ہے کہ ہو بہو ایسا ہی ہو گا بھی!''

ہماری گفتگو کے دوران میں کھوجی اللہ دتا ہم سے بے نیاز اپنے ٹیکنیکل کام میں مصروف تھا۔ اس کے انداز اور حرکات وسکنات سے لگتا تھا جیسے وہ اپنے کام کے علاوہ اس دنیا میں موجود ہر شے کو فراموش کر بیٹھا ہو۔ اس کا یہ عمل اپنے کام سے سچی لگن کا مظہر تھا۔

میں نے فاروق کے الجھن نما سوال کے جواب میں اللہ دتا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''فاروق.....اس اللہ کے بندے کو دیکھ رہے ہو؟''

اس نے کھوجی کی طرف دیکھا اور متذبذب لہجے میں بولا۔ ''جی.....!''

''تمہاری تمام تر الجھنوں اور سوالات کا جواب اس کے عمل میں پوشیدہ اور اس کی حرکات وسکنات سے ظاہر ہو رہا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''انسان اگر سچی لگن اور کڑی محنت سے کسی کام میں ہاتھ ڈالے اور اس مقصد کے لیے اس کی نیت بھی صاف ہو تو کامیابی یقیناً اس کے قدم چومتی ہے اور یہ کامیابی جو ہوتی ہے نا فاروق.....!'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر جملوں کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ اگر یکے بعد دیگرے انسان کے حصے میں آنے لگے تو اس کے اندر خود بخود اعتماد کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، پھر وہ بڑے اعتماد سے بڑی بڑی باتیں ایسے کرنے لگتا ہے جیسے کسی نے اسے اس بات کے لیے کوئی گارنٹی اور وارنٹی وغیرہ دے رکھی ہو۔ اتنا بتا دوں تمہیں کامیابی کے حصول کے سلسلے میں، میں بڑا خوش قسمت واقع ہوا ہوں۔''

یوں محسوس ہوتا تھا، مجید کھرل نے تھانے کے عملے کو اپنے سامنے زبان کھولنے سے خاص طور پر منع کر رکھا تھا۔ میرے دوستانہ انداز کو دیکھتے ہوئے فاروق کی جھجک جاتی رہی۔ وہ خاصے حوصلے کے ساتھ مجھ سے مستفسر ہوا۔

''فرض کریں ملک صاحب! اگر آپ کا سوچا ہوا نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ آپ کی محنت، لگن اور نیت میں کوئی فرق نہیں مگر وہ کامیابی آپ کے ہاتھ نہیں آتی جس کی توقع پر آپ سارا کھٹ راگ پھیلاتے ہیں تو.....؟''

''تو پھر اللہ مالک ہے.....!'' میں نے بے ساختہ جواب دیا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں جناب.....!'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''میری بات دھیان سے سنو فاروق!'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''اگر قدرت نے سب کچھ انسان ہی کے ہاتھ میں دے دیا ہوتا تو پھر وہ قادرِ مطلق کس سے کھیلتا۔ تقدیر کے ہاتھوں میں انسان ایک کھلونے کے مانند ہے۔ کسی بھی کھلونے کو ایک حد تک اختیار ہوتا ہے کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح انسان کو حاصل اختیار بھی محدود ہے۔ اسے اسی اختیار کے اندر رہتے ہوئے خلوص نیت، سچی لگن، انتھک کوشش اور کڑی محنت کے ساتھ کھیلنا چاہیے.....اور اگر اس سب کے باوجود بھی اس کے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے تو پھر اسے اپنا معاملہ اسی قادرِ مطلق پر چھوڑ دینا چاہیے جو دلوں کے بھید جانتا ہے اور نیتوں کے احوال پہچانتا ہے..... جب ہی میں نے تم سے کہا ہے.....تو پھر اللہ مالک ہے!''

وہ عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

یہ بات میرے تجربے میں آئی ہے اور اسی لیے ''تجربے کی بات'' میں آپ تک بھی پہنچا رہا ہوں کہ زندگی کے تمام تر معاملات میں چاہے وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، اللہ کی مرضی اور خوشی کو ضرور شامل رکھنا چاہیے اور اگر کوئی معاملہ اختیار اور گرفت سے باہر نکلنے لگے تو اسے اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ پروردگار کسی بھی بندے کا برا نہیں چاہتا کیونکہ ہر بندہ اس کا بندہ ہے.....اور کوئی بھی اپنی شے کو نقصان پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا!

چار بجے کے قریب مجھے اپنے راستے میں ایک ایسی چیز دکھائی دی جس نے میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑا دی۔ اس وقت تک ہم ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار ہو چکے تھے کہ اب

ہمیں واپسی کی راہ اختیار کرنا چاہیے۔ میں نے فاروق کی توجہ اس جانب مبذول کراتے ہوئے کہا۔

''دیکھو.....وہ درختوں کے بیچ کیا پڑا ہے؟''

میں نے یہ سوال محض اپنے خیالات کی تصدیق کے لیے پوچھا، ورنہ میں تو ایک نظر دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ وہ کیا ہوسکتا ہے۔ فاروق نے میری توقع کے عین مطابق جواب دیا۔ اس کی آواز میں خاصا اضطرار پایا جاتا تھا۔

''ملک صاحب..... مجھے تو یہ کوئی سوٹ کیس لگتا ہے.....!''

''بالکل درست۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ یہ وہی سوٹ کیس ہوگا جو مسلح ڈاکو برات میں سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے.....!''

ہماری باہمی سنسنی خیز گفتگو نے کھوجی اللہ دتا کو بھی مذکورہ سوٹ کیس کی جانب متوجہ کر دیا تھا لہٰذا وہ پہلی فرصت میں کھوج کھرے کا کام چھوڑ کر ہماری معیت میں ان درختوں کی طرف بڑھنے لگا جدھر وہ سوٹ کیس پڑا نظر آ رہا تھا۔

چند لمحات کے بعد ہم مذکورہ سوٹ کیس کے ''سر'' پر ''کھڑے'' تھے۔ وہ ایک سوا ایک فیصد وہی سوٹ کیس تھا جس کے بارے میں امیر بخش اور ستار حسین نے مجھے تفصیلاً بتایا تھا۔ گرے، ریڈ اور بلیک کلر کے استعمال سے تیار کردہ چیک دار ریگزین کا وہ سوٹ کیس منہ کھولے اپنی تباہی اور بربادی کی کہانی سنا رہا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق وہ ڈاکو غروبِ آفتاب کے قریب اس مقام پر پہنچے ہوں گے۔ وہ دن کی آخری روشنی میں اس کا جائزہ لینے کے بعد ہی آگے بڑھنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے مذکورہ چیک دار سوٹ کیس کی لمبائی لگ بھگ تین فٹ، چوڑائی پونے دو فٹ اور گہرائی کم از کم نو انچ تھی۔ اتنے بڑے سائز کے سوٹ کیس کو رات کی تاریکی میں اٹھائے پھرنا اور وہ بھی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر گھنے جنگل میں.....کوئی آسان کام نہیں تھا لہٰذا انہوں نے اسی مقام پر سوٹ کیس کا تیا پانچا کر ڈالا تھا۔

سوٹ کیس کو دلہن والی بیل گاڑی پر سوار کرانے سے پہلے یقیناً لاک کیا گیا ہوگا اور اس کی چابیاں بھی کسی ذمے دار شخص نے اپنے پاس سنبھال کر رکھی ہوں گی۔ ڈاکوؤں کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ چابیوں کی تلاش میں وقت ضائع کرتے لہٰذا بیچ جنگل میں انہوں نے اس سوٹ کیس کا گویا ''پوسٹ مارٹم'' کر ڈالا تھا۔

میں نے جائے وقوعۂ ثانی پر صرف پندرہ منٹ صرف کیے پھر اس مقام پر پائے جانے والے دو گھیر دار درختوں پر مخصوص نشانات بنائے تاکہ کل جب ہم اس جگہ سے اپنی کھوج والی کارروائی کو آگے بڑھائیں تو ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ پھر پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہم وہاں سے واپس آ گئے۔ ''مضروب اور گھائل'' سوٹ کیس کو میں اس کے باقی ماندہ ''مکینوں'' سمیت اپنے ساتھ لانا نہیں بھولا تھا۔

واپسی کے سفر میں بھی ہمارے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ موضوع ظاہر ہے، وہی نصف درجن ڈاکو اور ان کی شرمناک کارروائی ہی تھا۔ جب ہم جائے وقوعہ سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھے تو دھوپ نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا مگر تناور اور گھنے درختوں نے اس کی الوداعی کرنوں کے راستے میں اپنے ٹھنڈے ٹھار وجود کی رکاوٹ کھڑی کر دی تھی۔ فضا میں اچانک خنکی کا تناسب بڑھ گیا تھا۔

ہم میں سب سے زیادہ عمر کھوجی اللہ دتا کی تھی۔ وہ چند سال پیشتر ساٹھ کے ہندسے کو لات مار کر آگے بڑھ چکا تھا اور اب بھی وہ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے...... سردی کو لات مارتا ہوا ہی دکھائی دیتا تھا۔ ہم دونوں تو مناسب گرم لباس پہن کر ہی تھانے سے نکلے تھے لیکن اللہ دتا اپنے ٹریڈ مارک ''ململ اینڈ کمپنی'' لباس ہی میں ملبوس تھا لہٰذا میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''اللہ دتا! تم عمر میں مجھ سے کافی بڑے ہو۔ کیا میں تمہیں چاچا اللہ دتا کہہ کر پکار سکتا ہوں؟''

''بڑے شوق سے جناب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے۔ سب لوگ مجھے دتا چاچا ہی کہتے ہیں۔ آپ بھی کہہ لیا کریں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن میں تمہیں دتا چاچا نہیں بلکہ چاچا اللہ دتا کہوں گا یا پھر صرف چاچا...... کسی کے نام کو بگاڑ کر پکارنا اچھی بات نہیں۔''

''جو مرضی جناب کی......'' وہ سادگی سے بولا۔

''چاچا! ایک بات تو بتاؤ۔'' میں نے اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں واقعی سردی نہیں لگتی یا پھر برداشت کرتے ہو...... اور دوسروں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہو کہ موسم کوئی بھی ہو، تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟''

''مجھے تو لگتا ہے جناب.....!'' فاروق نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ''چاچا جی نے بلی کھا رکھی ہے.....!''

وہ دونوں ایک ہی گھوڑے پر سوار تھے۔ گھوڑے کی لگام فاروق کے ہاتھ میں تھی اور اللہ دتا اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا جبکہ میں زخمی سوٹ کیس کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر سوار تھا۔

کھوجی نے فاروق کی چوٹ کا برا نہیں منایا اور اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرنے کے بعد دھیمے لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! بات صرف احساس کی ہے۔ انسان گرمی اور سردی کو جتنا زیادہ محسوس کرتا ہے، یہ موسم اس پر اتنے ہی اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں بھی انہیں زیادہ اہمیت نہیں دیتا لہٰذا یہ بھلے مانس بھی مجھے زیادہ تنگ نہیں کرتے۔''

مگر میں اتنی آسانی سے اس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اضطراری لہجے میں، میں نے اس سے پوچھا۔ ''چاچا! اگر تم اپنی صحت کا راز..... بلکہ برداشت کا راز مجھے نہیں بتانا چاہتے تو تمہاری مرضی ہے۔ ورنہ میں نہیں مان سکتا کہ محض محسوس کرنے یا نہ کرنے سے موسموں کی شدت اثر انداز ہوتی ہو۔ اب دیکھو نا.....'' میں نے چند سیکنڈ کا توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں نے اچھے خاصے گرم کپڑے پہن رکھے ہیں لیکن پھر بھی میں سردی محسوس کر رہا ہوں۔ میرے مقابلے میں تم ململ کے کرتے میں ہو اور موسم کی شدت سے بے نیاز دکھائی دیتے ہو۔ میں کس طرح یہ تصور کر سکتا ہوں کہ فضا میں اس وقت ٹھنڈک بالکل نہیں ہے؟''

وہ کسی فلسفی کے انداز میں بولا۔ ''اگر کسی گرم کپڑے میں سردی کو روکنے کی صلاحیت ہوتی تو وہ سردی کا مقابلہ کرتے ہوئے کبھی ٹھنڈا نہ ہوتا۔ کیا ہم سردی کے موسم میں کسی گرم کپڑے کو چھوئیں تو وہ ہمیں گرم محسوس ہوتا ہے.....؟ نہیں نا!'' اس نے خود ہی سوال کیا اور خود ہی جواب بھی دیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اسی طرح موسم گرما میں اگر ہم کسی کاٹن کے ہلکے پھلکے لباس کو چھو کر دیکھیں تو وہ ہمیں برف کی ڈلی کے مانند ٹھنڈا محسوس نہیں ہوگا۔ یہ سارا چکر حرارت کے اخراج کا ہے تھانے دار صاحب؟''

''حرارت کا اخراج.....!'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''یہ کون سا

چکر ہے؟''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''انسان کا جسم ہر وقت حرارت خارج کرتا رہتا ہے۔ اگر کوئی انسان اپنی ضرورت کے مطابق اس اخراج پر کنٹرول حاصل کر لے تو پھر اسے سردیوں میں نہ تو گرم کپڑے پہننے کی حاجت رہتی ہے اور نہ ہی گرمیوں میں وہ باریک لباس کی طرف دوڑتا ہے۔ گرم لباس جسم میں سے خارج ہونے والی حرارت کو روک کر ہمیں گرمائش پہنچاتا ہے۔ وہ بذات خود گرم نہیں ہوتا۔ اسی طرح باریک اور ہلکا پھلکا کپڑا ٹھنڈا نہیں ہوتا بلکہ وہ جسمانی حرارت کو اخراج کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کرتا ہے۔''

''چاچا! تمہاری بات دل کو لگتی ہے اور ذہن بھی اسے تسلیم کرنے کو آمادہ نظر آتا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''لیکن جسم سے خارج ہونے والی حرارت پر کنٹرول کیونکر حاصل کیا جا سکتا ہے، ذرا اس کی بھی تو وضاحت کر دو؟''

''بہت سادہ سا عمل ہے لیکن اس کے لیے مشق کی ضرورت ہے۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔''اگر انسان اپنی سانسوں پر کنٹرول حاصل کر لے تو پھر اسے زندگی کے بیشتر معاملات پر خود بخود کنٹرول حاصل ہو جاتا ہے۔ سانس کھینچنے اور چھوڑنے میں اگر توازن قائم ہو جائے تو سمجھو، ستے خیراں.....!''

پھر میری فرمائش پر اس نے سانس لینے کی وہ مخصوص تیکنیک بھی مجھے بتا دی جس کی مناسب مشق کے بعد جسم سے ہیٹ کے اخراج کو کنٹرول کر کے سات قسم کی خیریت حاصل کی جا سکتی ہے۔ وہ بڈھا بابا ایک بنا بنایا تجربہ کار یوگی تھا!

''تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم نے کوئی بلی ولی نہیں کھائی ہوئی.....؟'' فاروق نے پُر اشتیاق لہجے میں سوال کیا۔

میں نے پوچھا۔''ہاں چاچا..... یہ بلی کھانے کا کیا شوشہ ہے؟''

وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔''یہ شوشہ میں نے بھی سن رکھا ہے۔ کہتے ہیں، اگر کوئی انسان بلی کا گوشت کھا لے تو پھر اسے برف کے پہاڑ پر بیٹھ کر بھی سردی محسوس نہیں ہوتی لیکن میرا خیال ہے کہ اس بات کی حقیقت قصے کہانی سے زیادہ کچھ نہیں۔'' ہم اسی طرح بات چیت کے سہارے ٹھیک سات بجے رات تھانے پہنچ گئے۔

✠ ✠ ✠

اگلے روز ہم تینوں اپنے مشن پر روانہ ہونے ہی والے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ آسمان پر تو رات ہی سے اچھے خاصے بادل نظر آ رہے تھے لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ بارش بھی ہو جائے گی۔ اصولی طور پر یہ بارش ہمارے مشن کے لیے بہت خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہوتی اسی لیے فاروق نے تشویش ناک انداز میں کہا۔

''لیں جی، ہو گیا کباڑا..... اس بارش نے تو ہماری محنت پر پانی پھیر دیا ہے!''

''برخوردار!'' میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بارش کا کام ہی پانی پھیرنا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتی کہ کسی نے زمین پر محنت کر رکھی ہے یا نہیں۔''

''لیکن جناب! ہمارا مشن کیسے آگے بڑھے گا۔'' فاروق اس بارش سے خاصا پریشان دکھائی دیتا تھا۔ ''ہم نے اب تک کھرا اٹھانے کے سلسلے میں جو کارکردگی دکھائی ہے اس کے آگے راستہ بند ہو گیا ہے۔ زمین گیلی ہو جانے کے باعث جنگل میں مزید کھرا نکالنا ممکن نہیں رہے گا۔ اگر ایک آدھ دن بارش نہ ہوتی تو ہم اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔''

''قدرت کے کاموں کا اپنا ایک مخصوص شیڈول ہے فاروق!'' میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ بارش جو بوندا باندی سے شروع ہوئی تھی، اب شدت پکڑتی نظر آ رہی تھی۔ ''اور وہ قادرِ مطلق اپنے معاملات کا شیڈول تیار کرتے ہوئے کسی سے صلاح مشورہ نہیں کرتا۔ اس کی مرضی ہے کہ بارش ہو تو..... بارش ہو کر رہے گی اللہ اللہ، خیر سلا.....!''

''پتر! تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اللہ دتا نے فاروق کی طرف دیکھتے ہوئے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''میں نے ان ڈاکوؤں کا جہاں تک کھرا اٹھایا ہے اس کی روشنی میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بدمعاش لٹیرے مغربی سمت میں سیدھے سفر کرتے ہوئے جنگل سے باہر نکلے ہوں گے اور زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ انہوں نے کوٹ فرمان علی کا رخ کیا ہو گا.....'' اس نے چند لمحے رک کر دو چار گہری سانسیں لیں پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں کسی قسم کا دعویٰ تو نہیں کر رہا لیکن مجھے امید ہے، اگر تھانے دار صاحب کوٹ فرمان علی سے اپنی باقاعدہ تفتیش کا آغاز کریں تو کامیابی کی کوئی کرن نظر آ سکتی ہے۔''

فاروق نے بددلی سے کہا۔''ہاں.....ایسا اسی صورت میں ممکن ہے کہ اگر وہ لوگ جنگل میں سے نکلنے کے بعد سیدھے فرمان علی کے کوٹ گئے ہوں اور یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ وہ جنگل کے کنارے کے ساتھ ساتھ کہیں اور بھی تو نکل سکتے ہیں.....!''

''ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے فاروق! یہاں تو صرف امکانات کی بات ہو رہی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''تم اپنے ذہن کو زیادہ نہیں الجھاؤ۔ ان شاءَ اللہ! ہمیں اپنی تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نظر آ ہی جائے گی۔''

''ان شاءَ اللہ.....!'' کھوجی اللہ دتا نے تہ دل سے کہا۔

اسی لمحے کانسٹیبل منظور میرے کمرے میں داخل ہوا اور اطلاع دینے والے انداز میں آ کر مجھے بتایا۔''ملک صاحب! چار بندے آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

''کون ہیں وہ لوگ!'' میں نے سوالیہ نظر سے کانسٹیبل کی جانب دیکھا۔''اور اس برستی بارش میں وہ کہاں سے آئے ہیں؟''

''جناب! ان کا تعلق اسی برات سے ہے جسے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا تھا۔'' کانسٹیبل منظور نے جواب دیا۔

''اوہ.....'' میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔''ٹھیک ہے، انہیں اندر بھیج دو۔''

میں ایک بات کا ذکر کرنا بھول گیا کہ کل رات جب ہم جنگل سے واپس لوٹے تھے تو اے ایس آئی اعجاز حسین میرے انتظار میں، تھانے میں موجود تھا اور اس کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ سہ پہر میں جن متاثرین برات کو میں نے تھانے میں بیانات کی غرض سے بلوایا تھا وہ نہیں پہنچے تھے۔ اس بات پر مجھے حیرت ہوئی تھی لیکن یہ سوچتے ہوئے میں نے اس معاملے کو ایشو بنانے کی کوشش نہیں کی کہ شادی والا گھر ہے۔ ہوسکتا ہے، وہ لوگ کسی بھی وجہ سے نہ آ پائے ہوں۔ ویسے یہ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ صاف موسم میں تو آئے نہیں اور برستی بارش میں ادھر آ نکلے تھے۔

کانسٹیبل نے جن چار ملاقاتیوں کا ذکر کیا تھا، وہ اگلے ہی لمحے میرے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان میں سے دو تو امیر بخش اور ستار حسین تھے اور باقی دو جھارا اور جھورا تھے۔ چودھری سلطان کے ان دو خاص بندوں کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا کیونکہ وہ لوگ دو روز پہلے برات میں شامل

نہیں تھے اور میں نے جائے وقوعہ پر امیر بخش اور ستار حسین کو خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ وہ گواہی اور بیانات کے لیے اپنے ہمراہ ان معتبر افراد کو لے آئیں جو برات میں شامل اور اس اندوہ ناک واقعے کے چشم دید گواہ ہوں۔ یہ ساری بھاگ دوڑ میں ڈاکوؤں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہی کر رہا تھا۔

بہر حال..... میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بیٹھ چکے تو ستار حسین نے مجھ سے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! ان مردود ڈاکوؤں کا کوئی سراغ ملا کہ نہیں؟''

''سراغ تو ملا ہے ستار حسین.....!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا سراغ ملا ہے سرکار؟'' جھارا نے بے تابی سے پوچھا۔

میں جھارا کی بے چینی پر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ میں نے سراغ کے حوالے سے ستار حسین کو بتایا تھا اور مزید سوال بھی اسی کو کرنا چاہیے تھا یا زیادہ سے زیادہ امیر بخش مجھ سے یہ بات پوچھ سکتا تھا۔ جھارا کی بے کلی بے سبب تھی لہٰذا میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جھارا تم تو غالباً اس برات میں شامل نہیں تھے جس پر مسلح ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا؟''

''جی ہاں، یہ بات میں نے آپ کو پرسوں بھی بتائی تھی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں اور جھورا چودھری صاحب کے ایک ضروری کام سے ایک دن پہلے ہی ادھر کوٹ فرمان علی گئے ہوئے تھے اسی لیے جبار حسین کی شادی میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔''

''کوٹ فرمان علی.....!'' میں نے زیر لب دہرایا۔

جھارا کی پیش کردہ وضاحت نے مجھے یاد دلایا کہ پرسوں جب اعجاز حسین نے کوٹ فرمان علی کا ذکر کیا تو میں چونکا کیوں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں نے یہ نام پہلے بھی کہیں سنا ہے..... کہاں؟ یہ اس وقت میرے ذہن میں نہیں آیا تھا اور اب مجھے اچھی طرح یاد آ گیا تھا کہ پہلی مرتبہ میں نے یہ نام جھورا اور جھارا ہی سے سنا تھا۔

''کیا ہوا تھانے دار صاحب!'' امیر بخش نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ کوٹ فرمان علی کے ذکر پر اس طرح چونک کیوں گئے۔ کیا ڈاکوؤں کے اس سراغ کا تعلق کسی حوالے سے کوٹ فرمان علی سے جڑا ہوا ہے؟''

امیر بخش نے بڑا کانٹے دار اور بروقت سوال کیا تھا لیکن چونکہ میرا ذہن جھورا اور جھارا

کی طرف سے ٹھٹک چکا تھا لہٰذا اپنے چونکنے کا سبب بیان کرنے کے بجائے میں نے الٹا اسی کو لتاڑ ڈالا۔

''امیر بخش! شاید تم لوگوں نے میری ہدایت کو یاد نہیں رکھا۔ یاد ہے، جائے وقوعہ پر میں نے تمہیں کیا تاکید کی تھی؟''

''جی مجھے یاد ہے، اچھی طرح یاد ہے۔'' امیر بخش کے بجائے ستار حسین نے جواب دیا۔ ''لیکن جناب! ہم چودھری صاحب کی بات بھی نہیں ٹال سکتے۔ چودھری سلطان ہمارے گاؤں کے مالک ومختار ہیں۔ انہوں نے ہی اپنے ان خاص بندوں کو ہمارے ساتھ بھیجا ہے۔''

''لیکن تم لوگ تو گزشتہ روز سہ پہر میں یہاں آنے والے تھے!'' میں نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ ''کیا یہ تاخیر بھی چودھری سلطان ہی کے کہنے پر کی گئی ہے؟''

''نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''وہ ہوا کچھ یوں تھا کہ کل ولیمے کی تقریب میں چودھری صاحب کو آنے میں دیر ہوگئی اسی وجہ سے کھانا بھی وقتِ مقررہ سے لیٹ شروع کیا گیا۔ جب ہم لوگ ولیمے سے فارغ ہوئے تو ساڑھے تین بج چکے تھے اس لیے ہم نے آپ کی طرف آنے کا پروگرام کینسل کر دیا۔ آج صبح ہی صبح ہم سلطان آباد سے روانہ ہوگئے تھے لیکن جسکانی پور پہنچے تو بارش شروع ہوگئی اس لیے بھیگتے بھاگتے یہاں پہنچے ہیں حالانکہ.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''حالانکہ امیر بخش نے بہت زور مارا کہ جسکانی پور میں رک کر بارش تھمنے کا انتظار کرتے ہیں پھر تھانے چلیں گے لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی اور دیگر لوگوں کو جسکانی پور میں چھوڑ کر ہم ادھر آ گئے ہیں۔''

''دیگر کون لوگ؟'' میں نے چونک کر اس سے پوچھا۔

''وہ جی صاعقہ اور جبار بھی ہمارے ساتھ آئے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ ایک رواج ہوتا ہے نا جناب..... کہ دلہا اور دلہن ولیمے کے بعد دلہن کے گھر میں ملنے کے لیے آتے ہیں۔''

''ہوں.....!'' میں نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

جھورا نے جلدی سے کہا۔ ''جناب! آپ ہماری وجہ سے پریشان نہ ہوں۔ دلہا دلہن جسکانی پور آ رہے تھے۔ چودھری صاحب نے ان کی حفاظت کی خاطر باڈی گارڈز کے طور پر ہمیں بھی ساتھ بھیج دیا ہے......!''

میرا دماغ ان لمحات میں بڑی تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ جھورا اور جھارا، جبار حسین کی شادی میں اس لیے شریک نہیں ہو سکے تھے کہ ایک روز قبل چودھری نے انہیں اپنے کسی ضروری کام سے کوٹ فرمان علی بھیج دیا تھا...... امیر بخش اور ستار حسین کل سہ پہر میں محض اس لیے مجھ سے ملنے تھانے نہیں آ سکے تھے کہ ادھر سلطان آباد میں چودھری سلطان کو ولیمے کی تقریب میں پہنچنے میں تاخیر ہو گئی تھی...... اور اب جھورا اور جھارا ان لوگوں کے ساتھ محافظ کی حیثیت سے یہاں پہنچ گئے تھے...... ممکن ہے، یہ سب کچھ اتفاقیہ ہو لیکن میری چھٹی حس بار بار مجھے احساس دلا رہی تھی کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ چودھری سلطان اور اس کے خاص بندے جھورا اور جھارا کرداروں کے حوالے سے غیر اہم نہیں ہیں۔ چھٹی حس کی پکار چونکہ واضح نہیں ہوتی اسی لیے میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

انہی تمام تر الجھن زدہ خیالات کے ساتھ میں نے جھورا کی وضاحت کے جواب میں کہا۔ ''جوان! میں آپ لوگوں کی وجہ سے بالکل پریشان نہیں ہوں۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تم دلہا دلہن کے ساتھ آ گئے۔ کاش! دو روز پہلے تم دونوں برات میں بھی شامل ہوتے...... تو پھر تم جیسے مسلح بہادروں کی موجودگی میں ڈاکوؤں کو دم مارنے کی جرأت نہ ہوتی اور دونوں خاندان اس تباہی اور بربادی سے بچ جاتے۔''

جھارا نے کہا۔ ''جناب! جو برائی مقدر میں لکھی ہو وہ آ کر ہی رہتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ سب کی جانیں محفوظ ہیں۔''

''اور عزتیں بھی۔'' جھورا نے گرہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اس برات میں دلہن کے علاوہ اچھی خاصی عورتیں اور لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ اگر وہ بدمعاش کسی قسم کی بدتمیزی پر اتر آتے تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔''

میں نے ان کے ذہنوں کو پُرسکون رکھنے کی خاطر ایک خاص مقصد سے کہا۔ ''آپ لوگ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ بس وہ کیا کہتے ہیں...... جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے......'' میں نے لمحاتی

توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے، اب بیانات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ تم سب لوگ باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو میں باری باری تمہیں اپنے پاس بلاتا ہوں۔''

وہ چاروں اٹھے اور کوئی سوال کیے بغیر میرے کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں نے فاروق سے کہا۔ ''فاروق! میں ان دونوں جھورا اور جھارا نامی مسٹنڈوں کی مکمل نگرانی چاہتا ہوں۔ وہ کہاں جاتے ہیں، کس کس سے ملتے ہیں اور کیا کرتے ہیں، مجھے سب پتا چلنا چاہیے۔ کیا تم سادہ لباس میں رہتے ہوئے یہ ڈیوٹی سرانجام دے سکتے ہو؟'' میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس کھینچی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اگر تم اس ٹاسک کے لیے تیار ہو تو فوراً مجھے بتاؤ۔ تم چاہو تو اپنے ساتھ کسی قابلِ بھروسا کانسٹیبل کو بھی رکھ سکتے ہو..... مجھے نتائج چاہئیں..... مثبت نتائج۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی سمجھ رہا ہوں بلکہ..... اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جوشیلے انداز میں بولا۔ ''مجھے یہ چیلنج منظور ہے لیکن اس کام کے لیے مجھے ابھی اور اسی وقت سلطان آباد روانہ ہونا ہوگا۔''

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''یہ دونوں..... جیسا کہ آپ سمجھ رہے ہیں، سن گن لینے سلطان آباد سے ادھر آئے ہیں لہٰذا جلد ہی واپس بھی جائیں گے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ ستار حسین اور دلہا دلہن کے ساتھ ہی جائیں گے۔ اگر یہ کسی قسم کی کارروائی میں ملوث ہیں جیسا کہ آپ کو خدشہ ہے اور مجھے بھی شک ہے..... تو اس معاملے کے ڈانڈے سلطان آباد سے کوٹ فرمان علی تک دیکھے جا سکتے ہیں لہٰذا ان پر نگاہ رکھنے کے لیے مجھے فوری طور پر اس علاقے کی طرف نکلنا ہوگا۔ ویسے بھی.....''

اس نے چند لمحات کا توقف کر کے ایک سکون آور گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ادھر سلطان آباد میں میری ایک خالہ رہتی ہے۔ مجھے وہاں کھپنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ میں اپنے ساتھ کانسٹیبل صدیق کو لے جاؤں گا۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں آپ کی توقع پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا ملک صاحب!''

''فاروق بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے ملک صاحب!'' اللہ دتا نے ماہرانہ انداز میں کہا۔ ''میں

بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں کہ یہ جھورا اور جھارا بلا مقصد یہاں تک نہیں آئے۔ ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے فاروق کی تجویز مناسب ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ تم جب چاہو، روانہ ہو سکتے ہو۔''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے انداز میں بڑا جوش اور ولولہ پایا جاتا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی اللہ دتا نے بھی سیٹ چھوڑ دی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! آپ تنہائی میں بیٹھ کر باری باری ان لوگوں کے بیانات لیں، میں بعد میں آپ سے بات کروں گا۔''

''ٹھیک ہے، تم لوگ جاؤ اور سب سے پہلے امیر بخش کو میرے پاس بھیج دو۔''

انہوں نے میری ہدایات پر عمل کیا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد دلہن کا چاچا امیر بخش میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ چودھری سلطان کے بھیجے ہوئے دونوں بندوں پر مجھے شک ہے۔ اگر وہ رازداری کا وعدہ کرے تو میں اسے چند اہم باتیں بتانا چاہتا ہوں۔''

وہ فوراً میرے خیالات کی گرفت میں آ گیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے بھی یہ بندے اچھے نہیں لگے۔ کوئی بات اس لیے نہیں کی کہ کہیں ستار کو بری نہ لگ جائے۔ آپ مجھ پر بھروسا کر سکتے ہیں۔ میں مرتے مر جاؤں گا لیکن آپ سے کیے ہوئے وعدے پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

''شاباش..... مجھے تم سے یہی امید تھی امیر بخش!'' میں نے تعریفی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔ ''آؤ، اب میں تمہیں وہ سراغ دکھاتا ہوں جس کا تھوڑی دیر پہلی میں نے ذکر کیا تھا۔''

وہ ہمہ تن گوش ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے وہ ٹوٹا پھوٹا سوٹ کیس ملاحظے کے لیے اس کے سامنے رکھ دیا جو ہمیں گھنے جنگل سے ملا تھا۔ وہ سوٹ کیس کو دیکھتے ہی پہچان گیا اور تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

''یہ سوٹ کیس ہم نے ہی صاعقہ کے ساتھ بھیجا تھا۔ اس کے اندر قیمتی ملبوسات اور چند طلائی زیورات رکھے ہوئے تھے مگر اب تو یہ ''بھائیں بھائیں'' کر رہا ہے۔ اس کا سامان کہاں گیا

اور یہ آپ کو کہاں سے ملا ہے؟''

میں نے اس کے سوالات کے جواب میں بتایا کہ وہ سوٹ کیس ہمیں کہاں سے ملا تھا پھر کہا۔''اس کا سامان وہی لٹیرے اپنے ساتھ لے گئے ہیں جنہوں نے دو روز پہلے تمہاری بھتیجی کی برات کو لوٹا تھا۔ میں نے کھوجی کی مدد سے ڈاکوؤں کا جو کھرا نکلوایا ہے اس کے مطابق وہ لوگ جنگل کے مغربی کنارے سے باہر نکل کر کوٹ فرمان علی کی طرف گئے تھے اور..... یہ دونوں سرکاری سانڈ بھی شادی سے ایک دن پہلے چودھری سلطان کے کسی کام سے ادھر ہی گئے ہوئے تھے اس لیے میں اس کیس کی کڑیاں ملانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''میں آپ کی بات کو بڑی وضاحت سے سمجھ گیا ہوں تھانے دار صاحب۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔''اب یہ بھی بتا دیں کہ مجھے باہر جا کر ان لوگوں سے کیا کہنا ہے؟''

''سوٹ کیس کا کوئی ذکر نہیں کرنا۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ میں نے ڈاکوؤں کا جو کھرا اٹھایا ہے اس کے مطابق وہ لوگ جنگل کے شمالی کنارے سے باہر نکل کر چک سیف کی طرف گئے ہیں اور یہ کہ اب میں ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے چک سیف میں چھاپا مارنے والا ہوں۔ میں بھی انہیں یہی بتاؤں گا۔ اس طرح وہ مطمئن رہیں گے اور مجھے ان کی اصلیت تک پہنچنے کے لیے زیادہ دشواری نہیں اٹھانا پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''بتائیں، میں باہر جا کر کس کو آپ کے پاس بھیجوں؟''

''اپنے ہم منصب ستار حسین کو.....!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں نے پروگرام کے مطابق ستار حسین کو''ٹریٹ'' کیا اور اس کے بعد جھورا اور جھارا کو ایک ساتھ اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اس بات پر الجھے ہوئے تھے کہ میں ان کے بیانات کیوں لینا چاہتا ہوں۔ میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک معمول کی کارروائی ہے۔ تم لوگ برات میں شامل تو نہیں تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے لوگوں کی طرح تمہاری یہی خواہش ہوگی کہ خود سر ڈاکوؤں کا وہ شیطانی ٹولا جلد از جلد قانون کی گرفت میں آ جائے۔''

''جی ہاں..... بالکل..... بالکل.....'' وہ بہ یک زبان ہو کر بولے۔ ''ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔''

پھر انہوں نے بڑے اشتیاق سے اس سراغ کے حوالے سے استفسار کیا جس کا میں ان کے سامنے ذکر کر چکا تھا اور میں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انہیں چک سیف والی کہانی سنا کر مطمئن کر دیا پھر پوچھا۔ ''چودھری سلطان نے آپ لوگوں کو کوٹ فرمان علی کس کام سے بھیجا تھا؟''

جواب دینے سے پہلے انہوں نے معنی خیز نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر جھورا نے سنبھلے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''ادھر کوٹ فرمان علی میں چودھری صاحب کی چھوٹی بیٹی بیاہی ہوئی ہے۔ اس کا نام صفورا اور اس کے شوہر کا نام چودھری خلیق ہے۔ چودھری سلطان نے اپنی بیٹی کے لیے چند تحائف بھیجے تھے جو ہم وہاں پہنچانے گئے تھے۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''اچھا اچھا.....'' میں نے سرسری سے لہجے میں کہا پھر درخواست کرنے والے انداز میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''جھورا..... جھارا..... تم لوگ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا اور اگر ان ڈاکوؤں کے بارے میں کوئی سن گن ملے تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔''

وہ دونوں میرے بچھائے ہوئے جال میں آ گئے اور بڑی مکاری سے مسکراتے ہوئے یکے بعد دیگرے بولے۔ ''آپ فکر ہی نہ کریں جناب..... اس سلسلے میں ہم آپ سے پورا تعاون کریں گے۔''

میں نے انہیں جانے کی اجازت دے دی اور ایک فوری خیال کے تحت اللہ دتا کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ میرے سامنے حاضر ہونے کے بعد بولا۔

''حکم ملک صاحب!''

''جھورا اور جھارا کا کھرا اٹھانا ہے لیکن انہیں اس بات کا احساس نہ ہو۔''

''میں نے انہیں مطلق احساس نہیں ہونے دیا جناب.....!'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''کک..... کیا مطلب.....؟'' الفاظ میرے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

''میں نے کانسٹیبل فاروق کو بھی سلطان آباد جانے سے روک دیا ہے۔'' وہ بدستور معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''آپ کو پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو اللہ دتا؟'' میری الجھن میں اضافہ ہو گیا۔

''یہی کہ.....'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔''آپ ابھی اپنی کرسی سے اٹھیں اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں ڈشکرے تھانے کے احاطے سے باہر قدم رکھیں، انہیں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ چھ ڈاکوؤں کے اس گروہ میں یہ دونوں بھی شامل تھے.....''

جب جھورا اور جھارا میرے کمرے میں مصروف تھے تو کھوجی اللہ دتا نے تھانے کے مختلف حصوں میں سے ان کا کھرا حاصل کرلیا تھا۔ یہ کام اس نے بڑی ہوشیاری اور چابک دستی سے کیا تھا۔ جنگل کے جس مقام پر ہمیں وہ سوٹ کیس پڑا ملا تھا، ادھر ان ڈاکوؤں کے قدموں کے نشانات بھی پائے گئے تھے۔ انہوں نے گھوڑوں سے نیچے اترنے کے بعد ہی سوٹ کیس کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ وہ کھرا اللہ دتا کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا لہٰذا اسے جھورا اور جھارا کے کھرے کو شناخت کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔

جب جھورا اور جھارا کو زیرِ تفتیش لا کر میں نے چند ''فارمولے'' آزمائے تو ان دونوں کی زبانوں کے قفل کھل گئے اور انہوں نے اپنے کالے کرتوتوں کی ساری کہانی تفصیل سے بیان کر دی۔ ان کی نشاندہی پر میں نے ان کے مزید چار ساتھیوں کو بھی گرفتار کرلیا۔ ان چاروں کا تعلق کوٹ فرمان علی نامی گاؤں سے تھا۔

اسی تفتیش کے دوران میں سب سے زیادہ سنسنی خیز انکشاف یہ ہوا کہ ان ڈاکوؤں اور لٹیروں کی مکمل پشت پناہی چودھری سلطان کیا کرتا تھا اور لوٹ مار کے اس ''کاروبار'' میں وہ ان کا برابر کا حصے دار بھی تھا۔

میں نے اس کیس کے تمام منفی کرداروں کو ان کے جرائم کے مطابق سزائیں دلوانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ میں مزید جتنا عرصہ بھی اس علاقے میں رہا، چوری اور ڈکیتی کی کوئی واردات سننے اور دیکھنے میں نہیں آئی۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ چور کو نہیں مارو اس کی ماں کو ختم کرو تاکہ آئندہ کوئی چور پیدا نہ ہو۔ میں نے بھی اسی کہاوت پر عمل کرتے ہوئے ڈاکوؤں کی ''اماں جان'' چودھری سلطان کو جیل کی دیواروں کے پیچھے پہنچا دیا تھا.....!

# کھرے سکے

آپ، میں اور ہم سب نے اپنے بزرگوں سے بچپن میں ایک کہانی سن رکھی ہے جو ایک کسان اور اس کے بیٹوں سے متعلق ہے۔ کہانی کے مطابق اس کسان کے چار بیٹے ہوتے ہیں۔ وہ چاروں ہڈحرامی اور کام چوری میں ہمیشہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں نظر آتے ہیں۔ کسان ان کی بے عمل زندگی کو دیکھ دیکھ کر دن رات کڑھتا رہتا ہے۔ انہیں سمجھانے کی ہر سعی ناکامیاب ہو جاتی ہے۔ کسان بوڑھا ہو جاتا ہے اور آخری کوشش کے طور پر انہیں پاس بلا کر نصیحت کرتا ہے..... دیکھو، اب میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں اور بیمار رہنے لگا ہوں.....!

اس کہانی کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ، میں اور ہم سب جانتے ہیں کہ کسان کے وہ چاروں کاہل الوجود بیٹے، زمین میں مدفون قیمتی خزانے کے لالچ میں، اپنے کھیتوں میں ایسی جاں فشانی سے کھدائی میں مصروف ہو گئے تھے کہ انہیں محنت کی عادت پڑ گئی۔ انہوں نے اپنے کھیتوں کا چپا چپا کھود ڈالا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد، وہ چاروں مل کر کھیتی باڑی اور کاشتکاری کرنے لگے۔ پھر وہی زمین ان کے لیے سونا اور ہیرے موتی اگلنے لگی۔

چودھری ناظم کی بھی کچھ ایسی ہی کہانی تھی۔ وہ دو بیٹوں کا باپ تھا جو آرام طلب اور کام چور واقع ہوئے تھے۔ وہ نہ تو خود اپنے ہاتھ سے کاشت کاری کرتا تھا اور نہ ہی بیٹوں سے کھیتی باڑی کرانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کام کے لیے درجنوں ملازم اور کھیت مزدور دن رات ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ چودھری ناظم چاہتا تھا کہ بیٹے اس کے سچے جانشین ثابت ہوں۔ امورِ چودھراہٹ کو سمجھیں اور اس کے بعد بھی خاندانی آن بان اور شان کا جھنڈا لہراتے رہیں لیکن ان

دونوں کو عیش و آرام اور آوارہ گردی کے علاوہ اور کسی کام میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

آپ نے، میں نے اور ہم سب نے بوڑھے کسان کی کہانی سن رکھی ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے، چودھری ناظم اپنے بزرگوں کے اس تحفے سے محروم رہا ہو، یقیناً اس نے بھی یہ کہانی سن رکھی تھی۔ بیٹوں کو سمجھانے سکھانے کی تمام تر کوششیں جب فیل ہو گئیں تو ایک رات اس نے دونوں کو اپنے پاس بلایا، وہ بھی بوڑھے کسان کو اپنا روحانی راہ نما مان کر ذہن میں ایک انوکھی کہانی بُن چکا تھا اور اسے امید تھی کہ اس کی یہ ترکیب ضرور اثر دکھائے گی۔

جو کہانیاں سینہ بہ سینہ بزرگوں کی زبانی بچوں تک پہنچتی ہیں وہ بڑی نصیحت آموز اور پُر معنی ہوتی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ ایسے واقعات ماضی بعید میں کبھی کہیں پیش آئے تھے یا نہیں، یہ تمام تر قصے اور کہانیاں اپنے اندر سیکھنے اور سکھانے کا ایک انمول خزانہ ضرور رکھتی ہیں۔

راشد اور ارشد کو اس بات پر حیرت تھی کہ باپ نے ان سے ایسی کون سی خاص بات کرنا ہے جو رات کو اپنے پاس بلایا ہے۔ راشد، ارشد سے دو سال بڑا تھا۔ ارشد کی عمر چوبیس سال تھی۔ راشد چھبیس سال کا تھا۔ ان دونوں کی آپس میں نہ تو گہری دوستی تھی اور نہ ہی کوئی خاص دشمنی..... بس رسمی سا تعلق تھا حالانکہ سگے بھائی ہونے کے ناتے رسمی اور سرسری نہیں بلکہ بڑا اٹوٹ تعلق ہونا چاہیے تھا جو کہ بدقسمتی سے نہیں تھا۔

شام کے وقت راشد نے ارشد سے پوچھا۔ ''ارشد! تمہیں کچھ اندازہ ہے۔ ابا جی ہم سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

ارشد نے بیزاری سے جواب دیا۔ ''ابا جی کے پاس کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر ہماری کوتاہیوں اور نالائقیوں کو گنوائیں گے اور آخر میں نصیحت کریں گے کہ ہمیں کام کاج پر توجہ دینا چاہیے اور اس راز کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے کہ اپنی چودھراہٹ کو کس طرح قائم و دائم رکھا جا سکتا ہے..... وغیرہ وغیرہ!''

''یہ سب تو وہ کریں گے ہی۔'' راشد گہری سنجیدگی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ آج وہ کوئی ایسی بات کہیں گے جو اس سے پہلے کبھی نہ کہی ہو.....''

''کون سی بات راشد؟'' ارشد کے کان کھڑے ہو گئے۔

راشد نے کہا۔ ''یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا..... وہ کیا کہنے والے ہیں!''

''تمہیں کس بات سے لگا کہ وہ کوئی نئی بات کریں گے؟'' ارشد کی سنجیدگی میں اضافہ ہوگیا۔ ''مجھے تو ایسا کچھ بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔''

''ہوسکتا ہے، کچھ بھی نہ ہو۔'' راشد نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے ان کے چہرے سے لگا جیسے وہ کسی بات کے لیے پریشان ہیں۔ وہ خاصے الجھے ہوئے تھے۔''

''ان کی الجھن کہیں وہی تو نہیں.....'' ارشد نے معنی خیز انداز میں بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔ ''تم سمجھ رہے ہو نا..... چند روز پہلے بھی ہم اس موضوع پر بات کر رہے تھے۔ تمہیں یاد ہے نا؟''

جس ''موضوع'' کا ارشد نے حوالہ دیا تھا، وہ چودھری ناظم کی چوتھی شادی سے متعلق تھا۔ راشد اور ارشد کی والدہ زاہدہ، چودھری کی تیسری بیوی تھی جو دس بارہ سال پہلے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی تھی پہلے دونوں بیویوں سے کوئی اولاد نہیں تھی۔

راشد نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں مذاق کی سوجھ رہی ہے اور میں سنجیدہ ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے، اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔'' ارشد نے بے پروائی سے کہا۔ ''رات کو ابا جی خود ہی بتا دیں گے کہ مسئلہ کیا ہے۔''

وہ دونوں اس موضوع کو لپیٹ کر اپنی اپنی راہ ہو لیے۔

''آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کہانی ایک انوکھے انداز سے شروع ہو رہی ہے۔ اس کی تفصیلات تو میں کہانی کے درمیان کہیں بیان کیا کرتا ہوں جبکہ کہانی کی ابتدا میں کیس پکڑنے سے کرتا ہوں اور پھر پرت در پرت واقعات کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ کہانی کہیں سے بھی شروع ہو، اسے مکمل ہونا چاہیے۔

رات کو سونے سے پہلے دونوں بھائی اپنے باپ کے کمرے میں پہنچ گئے۔ اس حویلی میں صرف یہی تینوں افراد اپنے ملازموں کے ساتھ رہتے تھے۔ چودھری ناظم اور اس کے یہ دونوں بیٹے جو ابھی غیر شادی شدہ تھے۔ ناظم، موضع نوری آباد کا چودھری تھا۔ یہ گاؤں لگ بھگ پانچ سو نفوس پر مشتمل تھا۔ یہاں پر تقریباً ایک سو تیس مکان تھے۔ یہ ایک روایتی قسم کا گاؤں تھا۔

چودھری دونوں بیٹوں کو اپنے سامنے دیکھ کر، اٹھ بیٹھا اور نقاہت بھرے لہجے میں بولا۔

''آؤ آؤ.....بھئی تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا!''

وہ دونوں چودھری ناظم کے بیڈ کے قریب رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور سوالیہ نظروں سے اپنے باپ کو دیکھنے لگے۔اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ ان لمحات میں چودھری بے حد پریشان اور الجھا ہوا دکھائی دیتا تھا، یہ الگ بات کہ وہ پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ پریشانی کی بھرپور ایکٹنگ بھی کر رہا تھا۔

''ابا جی.....خیریت تو ہے نا؟'' راشد نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ابھی تک تو خیریت ہی ہے.....'' وہ کھانسی کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب ابا جی.....؟'' ارشد نے متاملانہ انداز میں استفسار کیا۔

''مطلب یہ ہے پتر جی.....!'' چودھری نے ارشد کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔''اگر ابھی تک خیریت ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سدا خیریت ہی رہے گی۔کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

''ابا جی! آپ صاف صاف بات کیوں نہیں کرتے۔'' راشد کے لہجے میں حقیقی پریشانی تھی۔''آخر ایسا کیا ہونے والا ہے جو آپ اتنے الجھے ہوئے ہیں؟''

وہ باری باری، راشد اور ارشد کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر انداز میں بولا۔''میں ستر سے زیادہ کا ہو گیا ہوں.....اور کتنے دن جیوں گا۔اس لیے میں نے سوچا ہے کہ.....''

''ابا جی! آپ ایسی باتیں نہ کریں.....'' راشد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا، پھر تشویش ناک نظروں سے ارشد کی طرف دیکھنے لگا۔

ارشد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''اللہ مزید سو سال تک آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔آپ آج اتنے مایوس کیوں ہیں؟''

''میں مایوس نہیں ہوں بلکہ ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میرے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے اسی لیے میں نے سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کیا ہے.....؟''

چودھری نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ڈرامائی انداز میں بیٹوں کی جانب دیکھا تو ارشد نے بے تابی سے پوچھا۔''کس قسم کا فیصلہ ابا جی.....؟''

''بتاتا ہوں۔'' چودھری ناظم نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر گہری سنجیدگی سے

بولا۔''میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آنکھ بند ہونے سے پہلے میں اپنا جانشین مقرر کر جاؤں۔''

''جانشین.....؟'' دونوں نے چونک کر حیرت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر الجھن زدہ انداز میں اپنے ابا جی کو تکنے لگے۔

ابا جی چودھری ناظم نے بڑے رسان سے کہا۔''اصولی طور پر تو جو سب سے بڑا بیٹا ہوتا ہے وہی جانشین ٹھہرتا ہے۔ باپ کے انتقال کے بعد وہی سارے معاملات کو سنبھالتا اور چلاتا ہے۔''

''لیکن مجھے تم دونوں میں سے کوئی بھی اس قابل نظر نہیں آتا جو میری وفات کے بعد اس گاؤں کی چودھراہٹ سنبھالے۔ میں نے تم لوگوں کو ہزاروں مرتبہ سمجھانے کی کوشش کی کہ دیکھو..... جب میری آنکھ سدا کے لیے بند ہو جائے گی تو تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ زندگی گزارنا اتنا آسان نہیں ہے، جیسا تم سمجھ رہے ہو.....لیکن افسوس کہ تم دونوں نے کبھی میری کسی نصیحت کو توجہ سے سنا اور نہ ہی اس پر عمل کرنے کی کوشش کی.....'' وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہو کر ہانپنے لگا پھر سانس ہموار ہو جانے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''تم دونوں کے غیر سنجیدہ رویے سے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر کسی رات اچانک میری روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تو زمین، جائداد اور جانشینی کے سلسلے میں تم لوگوں میں بڑے خطرناک قسم کے تنازعات جنم لیں گے اور اللہ نہ کرے.....اللہ نہ کرے.....تم لوگ ایک دوسرے کے جانی دشمن اور لہو کے پیاسے ہو جاؤ، اس لیے میں نے.....''

''ابا جی! آپ کو ہو کیا گیا ہے.....'' راشد نے تشویش بھری نظر سے باپ کی طرف دیکھا۔''یہ اچانک آپ کا ذہن اتنے زیادہ خدشات میں کیوں گھر گیا ہے؟''

''اچانک نہیں پتر جی.....!'' اس نے شاکی نظر سے راشد کی آنکھوں میں جھانکا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔''یہ نتیجہ میں نے برسوں کے تجربے اور مشاہدے سے اخذ کیا ہے۔ تم لوگوں کا ایسا کیا ہے جو مجھ سے چھپا ہو.....اور یہ کہ..... پہلے مجھے اپنی بات پوری کرنے دو، پھر سوال جواب کرنا.....'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنی وصیت لکھواؤں گا اور اس پکی تحریر میں یہ بھی طے ہو جائے گا کہ میری موت کے بعد تم دونوں میں سے کون میرا جانشین بنے گا۔ جو جانشین ہوگا، وہی

موضع نوری آباد کا چودھری بھی بنے گا، دوسرے بھائی کو اس کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنا ہوگا ورفرض کرو، اگر وہ تعاون کرنے پر تیار نہ ہو تو پھر وہ اپنی مرضی سے بھی زندگی گزار سکتا ہے۔ وہ چاہے تو اپنی خواہش پر زمین و جائداد اور مال مویشی کا بٹوارہ بھی کر سکتا ہے لیکن اس علیحدگی کی صورت میں اسے وہ عزت اور مراعات حاصل نہیں ہوں گی جو گاؤں کے چودھری کے بھائی کی حیثیت سے حاصل ہونا چاہئیں، ایک ساتھ رہنے اور اتحاد و اتفاق سے زندگی گزارنے کی صورت میں سب کچھ ٹھیک اور اچھا ہوگا۔''

''لیکن ابا جی.....!'' چودھری ناظم کے خاموش ہوتے ہی ارشد نے تشویش ناک انداز میں استفسار کیا۔ ''آپ کی باتوں سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس وصیت کے مطابق، ہم دونوں میں سے کوئی بھی آپ کا جانشین مقرر ہو سکتا ہے..... چھوٹے بڑے کی کوئی قید نہیں؟''

''کوئی قید نہیں۔'' چودھری نے قطعیت سے کہا۔ ''جو بھی خود کو اس منصب کا اہل ثابت کر دے گا وہی میرا سچا جانشین ہوگا۔''

''اس کا مطلب ہے، ابا جی.....!'' راشد نے پُر سوچ انداز میں کہا۔ ''آپ نے ہمیں کسی کڑی آزمائش سے گزارنے کا پروگرام بنالیا ہے..... ہیں نا؟''

''اللہ تمہارا بھلا کرے!'' چودھری نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ آزمائش تو واقعی بڑی کڑی ہے، اب دیکھتا ہوں، تم دونوں میں سے سرخرو کون ہوتا ہے!''

''اور وہ آزمائش کیا ہے ابا جی.....!'' ارشد نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

چودھری ناظم نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ ''تم دونوں میں سے جو کوئی بھی میری بتائی ہوئی لڑکی سے شادی کر کے دکھائے گا، وہی میرا جانشین بنے گا۔ اس آزمائش کے نتیجے کے بعد ہی میں اپنی زندگی میں باقاعدہ وہ پکی وصیت لکھواؤں گا جو میرے مرنے کے بعد قابل عمل ہوگی اور اس وصیت کی روشنی میں نوری آباد کے آئندہ چودھری کا انتخاب کیا جائے گا.....!''

راشد اور ارشد لڑکی اور شادی والی بات پر مزید الجھ کر رہ گئے اور انہوں نے بیک وقت اپنے ابا جی سے پوچھا۔

''آپ کس لڑکی کی بات کر رہے ہیں.....؟''

''نزہت کی!'' چودھری ناظم نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

''نزہت؟'' راشد نے حیرت بھرے انداز میں دہرایا۔ ''آپ چاچا جی کی بیٹی کی بات کر رہے ہیں؟''

''ہاں، میں نے اسی نزہت کا ذکر کیا ہے۔'' چودھری نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

نوری آباد سے آٹھ میل کے فاصلے پر مغرب میں جلال پور نامی ایک گاؤں واقع تھا۔ نوری آباد کی بہ نسبت یہ گاؤں قدرے چھوٹا تھا، یہی کوئی ڈھائی، تین سو نفوس پر مشتمل۔ وہاں کے چودھری کا نام کاظم تھا اور کاظم، چودھری ناظم کا اکلوتا چھوٹا بھائی تھا۔ نزہت، چودھری کاظم کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ جس کی عمر لگ بھگ بائیس سال رہی ہوگی۔ نزہت سے بڑے دو بھائی تھے۔ حق نواز اور رب نواز۔ حق نواز سب سے بڑا اور شادی شدہ تھا۔ اس کی دو اولادیں تھیں۔ چار سالہ فوزیہ اور دو سالہ عثمان جبکہ حق نواز سے چھوٹے بھائی رب نواز کا تین سال پہلے، عین عالم شباب میں قتل ہو گیا تھا۔ یہ ایک دردناک واقعہ تھا جس کی تفصیل آئندہ کبھی ایک مکمل کہانی کی صورت میں پیش کی جائے گی۔ فی الحال بات نزہت کی ہو رہی ہے۔ راشد نے سوال کی شکل میں اپنی حیرت کا اظہار کر دیا تھا۔ اب ارشد کی باری تھی۔

''ابا جی! آپ بھی کمال کرتے ہیں!'' ارشد نے باپ کو شک زدہ نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چاچا جی ہمیں اچھی طرح جانتے ہیں اور آپ کی بہت بات بھی مانتے ہیں۔ آپ جس بیٹے کے لیے کہیں گے، وہ نزہت کا رشتہ دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ اس طرح تو آپ ہم میں سے جسے چاہیں، اپنا جانشین ثابت کروا سکتے ہیں۔ ہماری آزمائش کی کیا ضرورت ہے؟''

''اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ چودھری کاظم میری کوئی بات نہیں ٹالتا۔ میں نے تم دونوں کے بارے میں کاظم سے بات کی تھی.....!''

آخری جملہ اس نے اپنی پلاننگ کے عین مطابق ادا کیا تھا۔ دونوں بھائیوں کے چہروں پر تجسس بھرے زلزلے کے آثار پیدا ہوئے پھر انہوں نے یکے بعد دیگرے ایک ہی سوال دو مختلف انداز میں کیا۔ راشد نے سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''چاچا جی نے آپ کی بات کا کیا جواب دیا؟''

ارشد نے استفسار کیا۔ ''چاچا جی نے آپ کی بات کو کیسے لیا؟''

''اس نے بڑے تحمل سے میری بات سنی اور گہری سنجیدگی سے بولا۔'' چودھری ناظم نے ڈرامائی لہجے میں بتانا شروع کیا۔''بھائی جی! آپ مجھ سے بڑے ہیں، میں نے آج تک آپ کا کوئی حکم نہیں ٹالا.....اس بات سے بھی انکار نہیں کروں گا لیکن میں نزہت کی قسمت کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں دیتا ہوں، اسے آپ اپنی سگی بیٹی، اپنے جگر کا ٹکڑا سمجھیں اور.....خود ہی بتا دیں کہ اس کے لیے راشد موزوں رہے گا یا ارشد.....!''

''پھر.....پھر.....آپ نے ہم میں سے کس کا نام پیش کیا؟'' ارشد نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''کسی کا بھی نہیں!'' چودھری ناظم نے قطعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔''اگر میں نے تم میں سے کسی ایک کا نام تجویز کر دیا ہوتا تو پھر کڑی آزمائش کا کیا سوال تھا؟''

''لیکن پھر بھی.....!'' راشد نے تشویش ناک لہجے میں استفسار کیا۔''آپ نے چاچا جی سے کچھ نہ کچھ تو کہا ہی ہوگا؟''

''ہاں.....کہا تھا!'' چودھری ناظم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی اور تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔''میں نے کاظم سے بڑے واضح اور دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ میں ان دونوں میں سے کسی کو بھی نزہت کے قابل نہیں سمجھتا.....!''

''اوہ.....!'' ارشد کے ہونٹوں سے متاسفانہ آواز خارج ہوئی۔

راشد نے پوچھا۔''آپ کی بات سن کر چاچا جی نے کیا کہا؟''

''کاظم نے بڑی فرماں برداری سے جواب دیا تھا.....'' چودھری ناظم اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے سے بتانے لگا۔''بھائی جی! تو پھر آپ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اس قابل بنائیں.....میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے.....!''

''اور اب آپ ہمیں کسی قابل بنانے کے لیے ایک کٹھن امتحان میں ڈالنا چاہتے ہیں۔'' راشد نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔''ہے نا یہی بات.....؟''

''تم اس کو کچھ بھی سمجھو.....'' چودھری ناظم نے لاتعلقی کے سے انداز سے کہا۔''لیکن میری یہ خواہش ہے کہ تم دونوں اپنی ذمے داریوں کو سمجھنے لگو، تمہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ لوگ آپ لوگوں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ کاظم تو ہمارا اپنا ہے، وہ اگر میرا بے حد احترام کرتا

ہے تو تم دونوں سے بھی بڑی محبت کرتا ہے جب اس کی رائے یہ ہے کہ تم کسی قابل نہیں ہو تو سوچو، دوسرے لوگوں کا خیال کیا ہوگا اس لیے.....'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں اس آزمائش میں ضرور ڈالوں گا۔ مجھے امید ہے، تم دونوں نزہت کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کرو گے اور تم میں سے کوئی ایک اس کوشش میں ضرور کامیاب بھی ہوگا۔ ظاہر ہے، نزہت سے کسی ایک ہی کی شادی ہوگی لیکن دوسرے کی کوششوں کو بھی سراہا جائے گا۔ میری نظر میں تم دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ میں چاہتا ہوں تم دونوں میرا نام روشن کرو، میرے لیے تم دونوں برابر ہو لیکن جس طرح نزہت سے تم میں سے کسی ایک کی شادی ہو سکتی ہے بالکل اسی طرح میرے بعد اس گاؤں کا چودھری بھی کوئی ایک ہی بنے گا اور وہ وہی شخص ہوگا جو نزہت سے شادی کرنے میں کامیاب ہوگا اور دوسرے سے میرا وعدہ ہے.....'' وہ ایک بار پھر رکا، تولنے والی نظر سے باری باری دونوں کا جائزہ لیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''دوسرے سے میرا یہ وعدہ ہے کہ وہ جس لڑکی کو بھی پسند کرے گا، میں اس لڑکی سے اس کی شادی کروا دوں گا۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے۔'' راشد نے دانش مندی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ ہم میں سے کون جیتا ہے اور کون ہارا ہے.....؟''

''یہ فیصلہ تم دونوں کا چاچا کاظم کرے گا۔'' چودھری ناظم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم لوگوں کو سو دن دیے جائیں گے.....یعنی لگ بھگ تین مہینے۔ اس دوران میں تمہیں کچھ کر کے دکھانا ہوگا۔ چودھری کاظم تمہاری کارکردگی کا جائزہ لیتا رہے گا اور سو دن کے بعد وہ مجھے جو بھی رپورٹ دے گا، میں اسی کی روشنی میں اپنی وصیت تحریر کراؤں گا۔''

''لیکن ہمیں کرنا کیا ہوگا؟'' ارشد نے زچ ہونے والے انداز میں کہا۔

''یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔'' چودھری ناظم گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اپنے اپنے طور پر منصوبہ بناؤ کہ تم ایسا کیا کرو کہ تمہارا چاچا تمہیں کارآمد سمجھنے لگے۔''

''لیکن اس بات کی بھی تو وضاحت ہونا چاہیے نا کہ چاچا کاظم کس خوبی کی بنا پر ہم میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں گے؟''

''یہ میں نے کاظم سے پوچھا نہیں اور نہ ہی اس نے مجھے بتایا ہے۔'' چودھری ناظم نے بڑی سادگی سے کہا۔ ''جو کچھ بھی ہے، اسی کے ذہن میں ہے.....!''

''پھر تو بڑی مشکل ہو جائے گی.....!'' باپ کا جواب سن کر راشد گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ''پتا نہیں، چاچا کے ذہن میں کیا چھپا ہوا ہے.....؟''

ارشد نے کہا۔ ''ابا جی! آپ نے تو ہمیں الجھا کر رکھ دیا ہے.....!''

''ہاں، تم لوگ ٹھیک کہہ رہے ہو'' چودھری ناظم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ آزمائش خاصی مشکل اور الجھا دینے والی ہے لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ اگر کوئی کام حلوا ہو تو پھر اسے آزمائش کیوں کہا جائے؟''

وہ دونوں پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

پھر باپ کے کمرے سے نکل آئے..... منہ لٹکائے ہوئے!

✠ ✠ ✠

چودھری ناظم کی زندگی زیادہ تر تنہائی کا شکار رہی تھی۔ کچھ لوگ ایسی ہی قسمت لے کر آتے ہیں کہ انہیں محفل میسر نہیں آتی۔ چودھری ناظم کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ حالانکہ شادیوں کے معاملے میں اس کی کارکردگی کے نتیجے میں تو اس حویلی کو افراد سے خاصا ''آباد'' ہونا چاہیے تھا۔

چودھری نے پچیس سال کی عمر میں رحمانہ نامی ایک لڑکی سے پہلی شادی کی۔ رحمانہ ایک خوبصورت اور طرح دار لڑکی تھی۔ لیکن وہ چودھری کو اولاد نہ دے سکی چنانچہ دس سال بعد اس نے پینتیس سال کی عمر میں دوسری شادی کر لی۔ اس کی دوسری بیوی کا نام جمیلہ تھا۔

جمیلہ اپنے نام کا عکس تھی۔ رحمانہ نے دل سے تو نہیں، مجبوری میں جمیلہ کو قبول کر لیا تھا۔ کوئی بھی عورت اپنی سوکن کو جی جان سے کیسے برداشت کر سکتی ہے بہر حال، وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور کچھ عرصے بعد چودھری ناظم کو بڑی شدت سے یہ احساس ہوا کہ اس نے جس مقصد کی خاطر دوسری شادی کی تھی وہ پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ تین سال گزر جانے کے بعد بھی جمیلہ اسے خوشی کی کوئی خبر نہیں دے سکی تھی۔ پھر ماہ و سال کا سلسلہ دھیرے دھیرے آگے کھسکنے لگا۔

دوسری شادی کے سات سال بعد جب چودھری بیالیس سال کا ہو چکا اور ہنوز لاولد رہا،

اس نے تیسری شادی کر لی۔ مقصد وہی تھا.....اولاد کا حصول! اس موقع پر بہت سے لوگوں نے دبی زبان میں کہا بھی کہ چودھری چاہے سو شادیاں کر لے مگر وہ بے اولاد ہی رہے گا کیونکہ قصور وار بیویاں نہیں، بلکہ نقص اس کے اپنے اندر چھپا بیٹھا ہے.....!''

یہ خیال آرائی اور تبصرے چودھری ناظم کے کانوں تک بھی پہنچے لیکن چونکہ کسی نے براہِ راست اس سے کچھ نہیں کہا تھا لہٰذا وہ کسی کو منہ توڑ جواب نہ دے سکا۔ اس کی تیسری شادی زاہدہ نامی عورت سے ہوئی تھی۔ اس تیسری شادی کے دو سال بعد بھی اس حویلی میں کسی بچے کے رونے یا ہنسنے کی آواز نہ گونجی تو سب سے زیادہ تشویش زاہدہ کو ہوئی۔ اس سے پہلی دو عورتیں چودھری ناظم کو صاحبِ اولاد نہیں بنا سکی تھیں اور زاہدہ کو چودھری کے مزاج و عادات کی ہسٹری بھی معلوم ہو گئی تھی۔ یہ خیال ایک خطرناک ناگ بن کر اس کے احساس کو ڈسنے لگا کہ اگر وہ بھی چودھری کے بچے کی ماں نہ بن سکی تو کیا ہو گا.....؟

چودھری ناظم کی ''تاریخ حویلی'' کے پاس اس سوال کا ایک بہت ہی سیدھا سادہ جواب تھا کہ کچھ عرصے کے بعد چودھری یقیناً چوتھی شادی کر لے گا!

زاہدہ کے سر پر گویا ایک ننگی تلوار لٹک رہی تھی۔ اگر چودھری ناظم اس کی طرف سے مایوس ہو کر واقعی ایک اور شادی کا فیصلہ کر لیتا تو وہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ جب کسی محاذ پر انسان کے ساتھ مجبوریوں کی ایک لمبی قطار کھڑی ہو تو وہ دعاؤں پر کچھ زیادہ ہی انحصار کرنے لگتا ہے۔ زاہدہ کا بھی یہی حال تھا۔

وہ دن رات، جب بھی تنہائی میسر آتی، رو رو کر اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی کہ وہ اس کی سن لے تاکہ اس کی زندگی میں بہار آ جائے۔ چنانچہ اللہ نے اس کی سن لی اور شادی کے تین سال بعد اس نے راشد کو جنم دے کر اس حویلی کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کر دیا۔

اسی سال ایک اور اہم مگر افسوس ناک واقعہ بھی رُونما ہوا اور وہ یہ کہ چودھری ناظم کی زوجہ اول رحمانہ کا انتقال ہو گیا۔ پتا نہیں، اسے زاہدہ کی ''کامیابی'' اچھی نہیں لگی تھی یا اپنی ''ناکامیابی'' نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔

دو سال کے بعد راشد کا چھوٹا بھائی ارشد پیدا ہوا تو اس کے ساتھ ہی افسوسناک واقعے کی تجدید بھی ہوئی۔ ارشد ابھی چند ماہ ہی کا تھا کہ زوجہ دوم جمیلہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب حویلی میں

فیملی کے صرف چار افراد باقی رہ گئے تھے۔ چودھری ناظم، اس کی بیوی زاہدہ اور ان کی دو اولادیں راشد و ارشد!

بچے جیسے جیسے بڑے ہو رہے تھے، چودھری کی عمر بھی ڈھلتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی زاہدہ کی صحت بھی تسلی بخش نہیں رہی تھی۔ اس خاندان کی زندگی اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک روز زاہدہ بھی اپنے شوہر اور دونوں بچوں کو چھوڑ کر اِس دنیا سے اُس دنیا میں منتقل ہو گئی۔

اس وقت چودھری ناظم (یعنی جس زمانے کا یہ واقعہ ہے) ستر کا ہندسہ عبور کر چکا تھا۔ دس سال پہلے زاہدہ اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ زاہدہ کی وفات کے بعد کئی سمت سے یہ آواز بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں، سننے میں آئی تھی کہ اللہ خیر کرے.....اب چودھری چوتھی کے بارے میں ضرور سوچے گا لیکن ایسا کچھ دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد حاصل ہو چکا تھا یعنی زمین و جائداد کے وارث کا حصول، اس کے نام کو زندہ رکھ کر آگے بڑھائے مگر سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ چودھری ناظم کی یہ دونوں اولادیں کسی کام کی نہیں تھیں۔

اور اب .....جبکہ اسے پوری طرح احساس ہو چکا تھا، وہ دن دور نہیں جب وہ بھی اچانک ٹوٹ کر بکھر جائے گا، اس کا نام و نشان مٹ جائے گا تو.....اسے بیٹوں کی فکر ستانے لگی تھی اور.....اس نے انہیں ''کارآمد'' بنانے کے لیے ایک منصوبہ سوچ لیا تھا جس پر عمل کرنے کے لیے اس نے انہیں اپنے پاس بلا کر ایک چیلنج دیا تھا۔ اس منصوبے میں چودھری کا ظم بھی اس کے ساتھ تھا۔

✠ ✠ ✠

دونوں بھائی شدید الجھن کا شکار تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خود کو اپنے باپ کا جانشین ثابت کرنے کے لیے کیا کر دکھائیں۔ ایسا کون سا کارنامہ ہوگا جس کے بعد چودھری ناظم انہیں قابل اور اہل سمجھنے لگے گا۔ چنانچہ دو چار روز کی سوچ بچار کے بعد وہ ایک رات پھر اپنے باپ کے پاس پہنچ گئے، ان کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔

چودھری نے بغور ان کے چہروں کا جائزہ لیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کوئی

خوش خبری لے کر آئے ہو.....؟'' اس کے انداز میں مخصوص قسم کا طنز شامل تھا۔

''ابا جی!'' ارشد نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ ''آپ نے ہمیں بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے، خوش خبری اور بدخبری تو اس وقت ہوگی جب ہم اس مشن میں کود پڑیں گے۔ ابھی تک تو.....''

''تو کیا ابھی تک تم نے اپنا کام شروع نہیں کیا؟'' چودھری اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''تمہیں صرف سو دن کی مہلت دی گئی ہے جس میں سے تم لوگوں نے ایسے ہی آوارہ گردی میں، تین چار دن ضائع کر دیے جیسا اب تک کرتے آئے ہو.....ہوں!''

راشد قدرے متحمل اور ٹھنڈے مزاج کا مالک تھا جبکہ ارشد کی طبیعت میں غصہ اور اشتعال پایا جاتا تھا۔ اس وقت باپ کے سامنے بھی وہ اسی عادت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھنجلایا ہوا تھا۔ چودھری ناظم کے استفسار کے جواب میں راشد نے پوچھا۔ ''ابا جی! آپ کے اور چاچا جی کے درمیان کیا طے ہوا ہے اور چاچا جی کس خوبی کی بنا پر ہمیں پاس کریں گے اس کا کچھ علم ہمیں بھی تو ہونا چاہیے نا.....''

''دیکھو راشد!'' چودھری نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''ہمارے درمیان کوئی باقاعدہ منصوبہ بندی نہیں ہوئی۔ بس یہی طے ہوا تھا کہ کاظم اپنی بیٹی نزہت کی شادی تم دونوں میں سے اس کے ساتھ کرے گا جسے وہ قابل، سمجھدار اور سنجیدہ محسوس کرے گا اور میں نے اس معاملے میں، اسے حق بہ جانب جانتے ہوئے اس سے اتفاق کر لیا ہے۔ بس، اتنی سی بات ہے۔''

''تو کیا چاچا جی کو اس بات کا پتا ہے کہ آپ نے اپنی وصیت کا حوالہ دے کر ہمیں ایک آزمائش میں ڈالا ہے؟'' ارشد نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں.....'' چودھری ناظم نے گردن کو نفی میں جھٹکا دیا اور بولا۔ ''اس سلسلے میں میری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہ آزمائش اور وصیت والا معاملہ صرف ہم تینوں کے درمیان ہے۔ کاظم کو میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ دو تین ماہ تک آپ لوگوں کی مصروفیت اور کارکردگی کا جائزہ لیتا رہے۔ پھر تم دونوں میں سے جسے بھی نزہت کے قابل سمجھے، مجھے بتا دے۔ دیکھتا ہوں، اب تم میں سے کون خود کو ذمے دار اور قابل سمجھتا ہے!''

وہ دونوں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد راشد نے پوچھا۔

''ابا جی! کیا ہم چاچا جی کو اس راز میں شامل کر سکتے ہیں؟''

''کیا مطلب..... کس راز میں.....؟'' چودھری ناظم نے چونک کر پوچھا۔

راشد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہی کہ.....ہم انہیں صاف صاف بتا دیں کہ آپ نے ہمیں کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔ آپ تو کچھ بتا نہیں رہے۔ ہو سکتا ہے، چاچا جی ہمیں بتا دیں کہ ہم کیا کیا کر کے.....ان کی نظر میں معتبر ثابت ہو سکتے ہیں۔''

''مجھے تو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' چودھری نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کیونکہ ان دونوں چودھریوں میں پہلے ہی سب کچھ طے ہو چکا تھا۔

''میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی قابل بن کر دکھاؤ، لوگ تمہیں دیکھیں اور تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف کریں اور برملا کہیں، دیکھو..... چودھری ناظم کی اولاد کتنی ذمے دار اور سمجھ بوجھ والی ہے.....''

راشد نے ایک اور اہم سوال کیا۔ ''کیا ہم چاچا جی سے اس بات کا ذکر کر سکتے ہیں کہ آپ کوئی وصیت لکھوانے والے ہیں جس کا انحصار ان کی پیش کردہ رپورٹ پر ہوگا۔ وہ ہمارے بارے میں آپ کو جو کچھ بتائیں گے، آپ اسی کے مطابق وصیت تحریر کرائیں گے؟''

''میں نے تم لوگوں کو بتایا ہے نا کہ اس معاملے اور وصیت والی بات کا کاظم کو علم نہیں۔'' چودھری ناظم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ بات ہم باپ بیٹوں کے بیچ میں ہے لیکن اگر تم لوگ کوئی فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے چاچا یا کسی اور سے اس بات کا ذکر کرتے ہو تو میں تمہیں بالکل نہیں روکوں گا، یہ سب تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔''

''ہوں.....!'' ارشد نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ابا جی! میں آپ سے ایک آخری سوال کرنا چاہتا ہوں جو میری نظر میں بڑا اہم ہے، اس سوال نے پچھلے تین چار دن سے میرے دماغ کو چکرا رکھا ہے۔ ذہن میں طرح طرح کے اندیشے جنم لے رہے ہیں.....!''

''ہاں ہاں، بولو.....تمہارے ذہن میں ایسا کون سا خطرناک سوال چھپا بیٹھا ہے۔'' چودھری ناظم نے ارشد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم تین چار دن سے کیوں عذاب میں مبتلا ہو؟''

ارشد نے سنسنی خیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''ابا جی! ہم ایک منٹ کے لیے یہ فرض کر لیتے

ہیں کہ سودن کی مدت گزر جانے کے بعد بھی چاچا جی کو ہم میں کوئی گن نظر نہیں آتا۔ وہ ہماری کارکردگی سے بالکل مطمئن نہیں ہوتے۔ مطلب یہ کہ.....وہ ہمیں اس آزمائش میں فیل کر دیتے ہیں تو پھر کیا ہوگا؟''

''ہونا کیا ہے۔'' چودھری نے سرسری سے انداز میں جواب دیا۔''ظاہر ہے، کاظم اس صورت میں کسی بھی قیمت پر نزہت کو میری بہو بنانے پر تیار نہیں ہوگا۔''

''مجھے نزہت سے شادی کرنے کا زیادہ شوق نہیں ہے۔'' ارشد اپنے مخصوص تیکھے انداز میں بولا۔''اس کی شادی مجھ سے ہو، نہ ہو.....یا کسی سے بھی ہو، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو یہ.....!''

''پھر تمہیں کس بات سے فرق پڑتا ہے؟'' چودھری ناظم نے اس کی بات کاٹی اور قدرے درشت لہجے میں پوچھا۔''صاف صاف کہو، جو بھی تمہارے ذہن میں ہے.....؟''

اور ارشد نے دوٹوک انداز میں کہا۔''ابا جی! اگر چاچا کاظم ہمیں نااہل قرار دے دیتے ہیں تو پھر آپ کی وصیت کا کیا ہوگا۔ آپ تو مکمل طور پر انہی کی رپورٹ کو اہمیت دے رہے ہیں نا.....اس صورت میں آپ وصیت میں کیا لکھوائیں گے؟''

''ہوں.....'' چودھری ناظم نے گمبھیر انداز میں ایک گہری سانس خارج کی اور متذبذب لہجے میں بولا۔''اس بات کا فیصلہ بھی میں سودن کے بعد ہی کروں گا۔''

دونوں بھائی معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

چودھری نے کہا۔''تم لوگ اپنے ذہنوں کو مت الجھاؤ، سب سے اچھی بات یہ ہوگی کہ تمہیں جو بھی مہم میں نے سونپی ہے، اس میں لگ جاؤ۔ نتائج کی پروا کیے بغیر اپنی اپنی بہترین صلاحیتوں کو آزماڈالو۔ اللہ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ اس بات کا احساس تمہیں ضرور ہوگا.....''

''.....اگر کبھی تم لوگوں نے زندگی میں محنت کی ہوتی تو.....!''

وہ دونوں ایک مرتبہ پھر الجھن زدہ ذہنوں کے ساتھ اپنے ابا جی، چودھری ناظم کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

''مجھے تو لگتا ہے، ابا جی کا دماغ خراب ہوگیا ہے.....!'' ارشد نے سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ اس وقت حویلی کے ایک محفوظ اور پُرسکون حصے میں بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی وہ چودھری ناظم سے فائنل میٹنگ کر کے آئے تھے۔ چودھری کی باتوں کے نتیجے ہی میں ارشد کا دماغ تپا ہوا تھا جب ہی وہ راشد کے سامنے ذہن کا غبار نکال رہا تھا۔

راشد نے پُرسوچ انداز میں پوچھا۔ ''تم یہ بات کس بنا پر کہہ رہے ہو؟''

''بنا.....؟'' ارشد کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ ''راشد! ذرا سوچو.....غور کرو، ابا جی عمر کے آخری حصے میں کس قسم کی حرکتیں کرنے لگے ہیں، ان کا جو کچھ بھی ہے، وہ سب ہمارا ہی تو ہے۔ ہم لائق ہیں یا نالائق، اس بحث میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ دنیا کا کوئی بھی شخص اس بات کو رد نہیں کر سکتا کہ ہم دونوں ابا جی کے اصلی اور سچے وارث ہیں۔ تم مجھ سے عمر میں دو سال بڑے ہو لہٰذا اصول کے مطابق، تم ہی ابا جی کے بعد اس گاؤں کے چودھری بنو گے اور میں تمہارا چھوٹا بھائی ''چھوٹا چودھری'' کہلاؤں گا۔ اس علاقے کا نظام تم چلاؤ گے اور میں اس کام میں تم سے مکمل تعاون کروں گا۔ اللہ اللہ، خیر سلا.....!'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنے جذبات کی آواز کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں جو کہہ رہا ہوں کہ ابا جی کا دماغ خراب ہو گیا ہے تو اس کی بنا ان کی یہی الٹی سیدھی باتیں ہیں۔ انہیں یہ خدشہ کیوں ہے کہ ان کی فوتگی کے بعد ہم آپس میں لڑنے جھگڑنے لگیں گے۔ سب کچھ تباہ ہو کر رہ جائے گا حتیٰ کہ ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے اور اسی لیے انہوں نے ہمیں وصیت کے چکر میں ڈال کر نزہت سے شادی والی آزمائش میں پھنسا دیا ہے۔ کیا کوئی ہوش مند آدمی اپنی اولاد کے ساتھ ایسا کرتا ہے؟''

''نہیں.....!'' راشد نے اس کی تائید کی اور بولا۔ ''ابا جی یہ سارا کھٹ راگ اس لیے پھیلا رہے ہیں کہ وہ ہمیں نالائق اور بے کار سمجھتے ہیں۔ ہمارا تماشا بنا رہے ہیں۔''

''اسی لیے تو میں کہتا ہوں ابا جی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' ارشد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لوگ ساٹھ سال کی عمر میں سٹھیا جاتے ہیں۔''

''اب کچھ بھی ہے.....'' راشد نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''انہوں نے جو امتحان ہمارے سامنے رکھا ہے، اس میں تو بیٹھنا ہی ہوگا.....چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو!''

''یار! کیا ہم اتنے ہی گرے پڑے اور گئے گزرے ہیں کہ ہماری قسمت اور تقدیر کا

فیصلہ چاچا کا ظلم کرے گا!'' ارشد نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہ تو بڑی ذلت اور شرم کی بات ہے۔ کیا تم خود کو اس احمقانہ امتحان میں ڈالنے کے لیے تیار ہو؟''

''ظاہر ہے، یہ تو کرنا ہی ہوگا۔'' راشد نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''ہمارے پاس اب اور کوئی چارہ کار بھی تو نہیں۔''

''ہے چارۂ کار.....!'' ارشد نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

راشد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''اور کیا چارۂ کار ہے؟''

''ابا جی ہمیں نکھٹو اور نالائق سمجھتے ہیں نا!'' ارشد نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ ''کیوں نہ ہم دماغ کا استعمال کر کے ان کی اس رائے کو غلط ثابت کر دیں۔''

''لیکن اس کے لیے ہمیں کرنا کیا ہوگا؟'' راشد نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ڈراما.....ڈراما کرنا ہوگا۔'' ارشد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''راشد! اگر تم اس ڈرامے میں میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاؤ تو مزہ آ جائے گا۔''

''کیسا ڈراما؟'' راشد استعجابیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

ارشد پُراسرار انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کے مطابق، ہمیں بھرپور اداکاری کرنا ہوگی، میرے ذہن میں ہم دونوں کا رول ہے۔ اگر ہم نے اپنے اپنے حصے کی ایکٹنگ نبھالی تو سمجھو ہمارا کام بن جائے گا۔''

''لیکن کچھ آئیڈیے کے بارے میں بھی تو بتاؤ۔'' راشد نے آواز دبا کر کہا۔ ارشد کی باتوں میں اسے گہری دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ ''ہمیں کس قسم کی ایکٹنگ کرنا ہوگی؟''

''ابا جی کو اُلّو بنانے کی ایکٹنگ.....!'' ارشد ایک آنکھ دبا کر بولا۔

''کیا مطلب.....؟'' راشد بھونچکا رہ گیا۔

''ابا جی ہمیں کسی لائق نہیں سمجھتے حالانکہ ہم کسی سے کم نہیں ہیں۔'' ارشد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اسی لیے وہ ہمیں اس بھونڈے امتحان میں ڈال کر بے وقوف بنا رہے ہیں لہٰذا ہم جواباً انہیں اُلّو بنانے کے لیے ایک ناٹک کریں گے.....ہم.....اپنی اپنی اداکاری سے یہی ظاہر کریں گے کہ ہم نزہت کے حصول اور چاچی جی کی خوشنودی کے لیے ہم بھرپور کوشش کر رہے ہیں، یہ الگ

بات کہ ہم دونوں کی کوششوں میں زمین آسمان کا فرق ہوگا.....!''

''کیا مطلب.....؟'' راشد نے تعجب خیز نظر سے بھائی کو دیکھا۔

''مطلب یہ کہ ہم چاچا جی کو متاثر کرنے کے لیے کوشش کرتے نظر آئیں گے لیکن بظاہر یوں دکھائی دے گا کہ میں اس معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوں، مجھے خود کو منوانے اور نزہت کو حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں جیسا کہ میں ابا جی کو بتا بھی چکا ہوں جبکہ تم.....''

اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''راشد! جبکہ تم اپنی کوشش میں بڑے سچے اور سنجیدہ نظر آؤ گے، تم کل ہی موضع جلال پور جاؤ گے، چاچا جی سے ملنے اور پھر ہر دوسرے، تیسرے دن تمہارا وہاں چکر لگتا رہے گا، مجھے یقین ہے کہ ابا جی نے چاچا کاظم کو سب کچھ بتا رکھا ہے اور یہ دونوں بھائی مل کر اس چکر بازی سے ہمیں سدھارنے کی کوشش کر رہے ہیں جیسے ہم کوئی بہت ہی بگڑے ہوئے ہیں!'' وہ چند لمحات کے لیے تھما، ٹٹولتی ہوئی نظر سے راشد کو دیکھا اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''راشد! اگر تم نے میری ہدایت اور پلاننگ کے مطابق عمل کیا تو دیکھنا، سو دن تو بہت دور کی بات ہے.....ہم ایک آدھ ماہ ہی میں اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہاری ہر بات مانتا جاؤں گا۔'' راشد نے گہری سنجیدگی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب بتاؤ، تمہارے ذہن میں کون سا منصوبہ پل رہا ہے؟''

''جلال پور جا کر چاچا جی کو مکھن لگانے کے بارے میں تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔'' ارشد نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تم ان سے ملو اور ابا جی کے خلاف کچھ اس قسم کی باتیں کرو کہ وہ تم سے ناخوش ہیں، تمہیں کچھ سمجھتے ہی نہیں حالانکہ تم تو بڑے قابل اور لائق ہو۔ ابا جی نے چاچا جی کے ساتھ مل کر منصوبہ بندی تیار کی ہے۔ چاچا جی یقیناً تمہاری ایسی باتیں سن کر تم سے ہمدردی جتائیں گے اور تمہیں وہ گُر بتائیں گے جن کی مدد سے تم ابا جی کی نظر میں معتبر اور سمجھدار ثابت ہو سکو۔ بس آنکھیں بند کر کے تم ان کی باتوں پر عمل کرتے جانا۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ ان کی نصیحت کام کر رہی ہے۔ تمہاری ''کارکردگی'' کی رپورٹ وہ جلد ہی ابا جی کو دیں گے۔ لہٰذا کچھ ہی عرصے کے بعد ابا جی کو یقین آ جائے گا کہ وہ تمہیں جواب تک نالائق اور ناکارہ سمجھتے آئے تھے ان کی وہ رائے درست نہیں تھی۔ اس طرح تمہاری طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ تمہیں اپنی وصیت میں اس گاؤں کا

آئندہ چودھری مقرر کردیں گے۔تمہاری نزہت سے شادی ہوجائے گی اور.....اللہ اللہ، خیر سلا!''

''اور تم.....؟'' راشد نے سوالیہ نظر سے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا۔

''میں بھی تمہارے چھوٹے بھائی یعنی چھوٹے چودھری کی حیثیت سے اس حویلی میں رہوں گا ہر کام اور امور میں تمہاری مدد کروں گا جس کے نتیجے میں مجھے وہ تمام مراعات اور سہولیات میسر ہوں گی جو کسی بھی چودھری کے چھوٹے بھائی کو ہوتی ہیں۔ یہ ترتیب اور حالات عین فطری ہوں گے۔فرض کرو.....''

وہ ذرا سی دیر کے لیے رکا پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا۔''.....اگر ابا جی کا اچانک انتقال ہوجاتا ہے اور وصیت ایک طرف رکھی جاتی ہے تو بھی.....ہمیں ایسی ہی صورتِ حال سے سامنا ہوگا۔میرے پروگرام پر عمل کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کم از کم تم ان کی نظر میں اچھے ثابت ہوجاؤ گے اور نزہت سے تمہاری شادی بھی ہوجائے گی۔''

''ایک بات سچ سچ بتاؤ ارشد!'' راشد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تمہارے دل میں یہ خواہش نہیں کہ نزہت جیسی پُرکشش اور حسین وجمیل لڑکی سے تمہاری شادی ہو اور آئندہ کے لیے نوری آباد کا چودھری بھی تمہیں ہی مقرر کیا جائے۔تم جو کچھ مجھے دلوانے کے خواہش مند ہو وہ سب تمہیں حاصل ہو.....؟''

''تم نے کہا ہے، سچ سچ بتاؤں تو سچ سچ سنو.....'' ارشد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ نزہت بہت ہی خوبصورت لڑکی ہے۔اس سے شادی کی خواہش اگر میرے دل میں ہو تو یہ کسی بھی صورت غلط نہ ہوگا۔اسی طرح اگر ابا جی اپنے بعد مجھے نوری آباد کا چودھری مقرر کرتے ہیں تو یہ بڑے اعزاز اور فخر کی بات ہوگی لیکن یہ بھی تو سوچو.....'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، تھوک نگل کر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ بڑی غور طلب اور حقیقی بات ہے کہ نزہت سے صرف ایک شخص ہی شادی کرسکتا ہے۔اسی طرح ہم میں سے کوئی ایک بھائی نوری آباد کا آئندہ چودھری مقرر ہوسکتا ہے۔نہ تو ایک گاؤں کے دو چودھری ہوتے ہیں اور نہ ہی ایک عورت کے دو شوہر ہو سکتے ہیں لہٰذا.....ان دونوں ''حلقوں'' میں تمہارا بلا مقابلہ منتخب ہونا ہی ہم دونوں کے لیے سود مند ہے اسی طرح ہم بہت بڑے نقصان سے محفوظ رہیں گے۔''

''کیسا نقصان؟'' راشد پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''یہی نقصان کہ.....'' ارشد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''اگر ہم نے بالکل ہی کوئی کارکردگی نہ دکھائی یا بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے کا مقابلہ کیا اور چاچا جی کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ ہم میں سے کون ان کا داماد بننے کا اہل ہے تو یہ سارا معاملہ الجھن میں پڑ سکتا ہے۔اس صورتِ حال میں ابا جی کوئی بھی ایسی وصیت لکھوا سکتے ہیں کہ ہم دونوں ہی کو زمین، جائداد اور ہر نوعیت کی وراثت سے محروم کر دیا جائے چنانچہ ہم میں سے کسی ایک کو چاچا جی کا دل جیتنا ہوگا ورنہ مجھے ایک اور ڈر بھی ہے.....!''

ارشد جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوا تو راشد نے تشویش بھرے انداز میں استفسار کیا۔''تمہارا اشارہ کس ڈر کی طرف ہے.....؟''

''تم جانتے ہو نا، ابا جی اپنے چھوٹے بھائی یعنی چاچا کاظم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔'' ارشد نے پُراسرار لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''اگر وہ ہم دونوں کی طرف سے مایوس ہو گئے تو وہ وصیت میں یہ ساری زمین و جائداد چاچا جی کے نام بھی لکھوا سکتے ہیں.....ہم گھر کے رہیں گے اور نہ ہی گھاٹ کے دھوبی کے کتے کی طرح ادھر اُدھر ''چیاؤں پیاؤں'' اور ''بھوں بھوں'' کرتے نظر آئیں گے۔''

راشد کے چہرے اور آنکھوں میں تشویش کے تاثرات نمودار ہوئے، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔''یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو!''

''یہی نہیں، میں سب کچھ ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' ارشد نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' راشد نے سر کو اثباتی جنبش دی۔''میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں لیکن ابا جی یا چاچا جی کو اس بات سے شک ہو سکتا ہے کہ تم اس آزمائش میں بھرپور حصہ کیوں نہیں لے رہے ہو؟''

''میں حصہ لیتا ہوا نظر آؤں گا.....'' ارشد ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔''لیکن ایسے نتائج نہیں دوں گا کہ چاچا جی مجھ سے متاثر ہوں اور انہیں فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری محسوس ہو۔تم میری بات سمجھ رہے ہو نا.....؟''

راشد نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

یہ تھے چودھری ناظم کے وہ دو عدد سپوت جنہیں وہ بے کار اور نالائق سمجھتا تھا۔ اگر وہ کہیں چھپ کر ان کی منصوبہ بندی سن لیتا تو اس کے چودہ طبق یک لخت گل ہو کر رہ جاتے۔ ایسی ''ہونہار'' اور ''ٹیلنٹڈ'' اولاد تو اللہ کسی کسی کو ہی دیتا ہے۔

✠ ✠ ✠

اگلے روز سے انہوں نے اپنے ''پروگرام'' پر عمل شروع کر دیا۔

راشد اپنے ابا جی سے اجازت لے کر چاچا جی سے ملنے جلال پور روانہ ہو گیا۔ نوری آباد اور جلال پور میں لگ بھگ آٹھ میل کا فاصلہ حائل تھا۔ وہ دونوں چاہے کتنے بھی نالائق اور ہڈ حرام کیوں نہ ہوں لیکن یہ بات ماننا ہو گی کہ ارشد کا دماغ منفی سرگرمیوں میں بہت چلتا تھا۔ اس نے چودھری ناظم کو اُلو بنانے اور اس کی ڈالی ہوئی آزمائش کا توڑ کرنے کے لیے جو منصوبہ بندی کی تھی اس کے نتیجے میں، انہی کا فائدہ ہونے والا تھا۔ اس کا شیطانی دماغ بڑی آسانی سے اس راز تک پہنچ گیا تھا کہ ابا جی اور چاچا جی نے کسی گٹھ جوڑ کے نتیجے ہی میں انہیں اس راہ پر ڈالا ہے۔

دو تین ''پھیروں'' کے بعد راشد نے چودھری کاظم سے پوچھا۔ ''چاچا جی! ایک بات تو بتائیں.....؟''

چودھری کاظم ہمہ تن گوش ہو گیا اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں، پتر جی! کیا بات ہے؟''

''کیا میں آپ کو نکما اور نکھٹو نظر آتا ہوں؟'' راشد نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں پتر۔'' چودھری کاظم نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ''کون کہتا ہے کہ تم ایسے ہو؟''

''میرے بارے میں ابا جی کا خیال ایسا ہی ہے!'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

''پتا نہیں، بھائی جی نے کیا سوچ کر ایسا کہا ہے۔'' کاظم نے سنجیدگی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو تم ٹھیک ٹھاک اور قابل نظر آتے ہو۔ میں بھائی جی سے بات کروں گا.....''

''اس کی ضرورت نہیں ہے چاچا جی.....!'' راشد نے جلدی سے کہا اور ٹٹولتی ہوئی نظر سے اپنے چاچا جی کو تکنے لگا۔

چودھری ناظم نے دونوں بیٹوں سے بات کرتے ہوئے ان کی شادی کا حوالہ بھی دیا تھا

اور واضح طور پر یہ کہا تھا کہ چودھری کاظم نے نزہت کے رشتے سے محض اس لیے انکار کیا ہے کہ وہ اپنے بھتیجوں کو نکما اور نالائق سمجھتا ہے۔ اس تناظر میں چودھری کاظم کا حالیہ رویہ فکر انگیز تھا۔ وہ اس وقت راشد کی حمایت میں بول رہا تھا جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ''ابا جی'' نے نزہت کے رشتے والی وہ بات بالکل غلط کہی تھی اور اگر بالفرض محال..... چودھری ناظم نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا تو اس کا مطلب تھا، اب ''چاچا جی'' ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اسے بے وقوف بنا رہے تھے گویا..... ارشد کا یہ خدشہ بالکل درست تھا کہ وہ دونوں بھائی باہمی مشاورت سے ان دونوں بھائیوں سے ''کھیل'' رہے تھے لہٰذا..... انہیں بھی اسی صفائی سے یہ کھیل جاری رکھنا تھا۔

چودھری کاظم نے راشد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ''پتر جی! تم ایک کام کرو .....''

''کیا کام چاچا جی؟'' راشد، چودھری کاظم کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔

''اگر بھائی جی تمہاری کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں تو اس مسئلے کا ایک حل ہے۔'' کاظم نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ ''تم اپنے عمل سے ان پر ثابت کر دو کہ تمہارے بارے میں ان کا خیال درست نہیں۔ تم ہر حوالے سے سمجھدار، معقول اور عقلمند انسان ہو۔''

''لیکن میں یہ سب کچھ کیسے ثابت کروں چاچا جی؟''

''اپنے عمل اور کارکردگی سے۔'' کاظم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک بات اپنے ذہن میں نقش کر لو کہ کسی بھی چودھری اور زمیندار کے لیے سب سے زیادہ اہمیت زمین کی ہوتی ہے کیونکہ اسی زمین کی وسعت کی بنا پر کسی چودھری کو چھوٹا اور بڑا کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ والدین اسی اولاد کو قابل اور سمجھدار تصور کرتے ہیں جس کی نظر زمینداری پر ہو اور بدقسمتی سے تمہارا رجحان زمینداری کی طرف نہیں ہے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے درجنوں نوکر چاکر سہی لیکن اس عمر میں بھی بھائی جی ہی کو زمینداری کے سارے معاملات کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنا پڑتی ہے۔ تم آسانی سے سمجھنے کے لیے میری مثال لے لو نا.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میرے پاس تو بھائی جی سے کہیں کم زمین ہے اور میں عمر میں ان سے بارہ پندرہ سال چھوٹا بھی ہوں لیکن اس کے باوجود زمینداری کا سارا انتظام حق نواز نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔

وہ شادی شدہ ہے، اس کے دو بچے ہیں۔ اس کی گھریلو ذمے داریاں بھی اپنی جگہ ہیں لیکن مجال ہے کہ زمینداری کے حوالے سے مجھے کسی فکر میں پڑنا پڑے۔ جب رب نواز زندہ تھا تو یہ کام دونوں بھائی مل کر کیا کرتے تھے..... دیکھو پتر جی!''

چودھری کاظم نے لمحاتی توقف کر کے راشد کی آنکھوں میں دیکھا پھر گمبھیر لہجے میں بولا۔

''بھائی جی کے پاس کوئی سوا سو، ڈیڑھ سو ایکڑ اراضی ہے۔ اس زمین پر کاشت کاری اور کھیتی باڑی کے لیے ملازموں اور مزدوروں کی بھی کوئی کمی نہیں لیکن..... وہ جو بات میں نے پہلے کہی ہے نا کہ بھائی جی تہتر سال کے ہو گئے ہیں اور اس عمر میں بھی انہیں تمام امور کی نگرانی خود ہی کرنا پڑ رہی ہے تو..... اس نکتے کو سمجھنے کی کوشش کرو..... مجھے سو فیصد امید ہے، بلکہ یقین ہے کہ اگر تم.....''

چودھری کاظم نے ڈرامائی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک بوجھل سانس خارج کی پھر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''راشد پتر! اگر تم بھی حق نواز کی طرح بھائی جی کے کندھوں اور ذہن کا بوجھ ہلکا کر دو تو وہ تمہیں اپنی سب سے زیادہ لائق فائق اولاد سمجھنے لگیں گے۔ اگر میری بات کا بھروسا نہ ہو تو آزما کر دیکھ لو.....!''

چودھری کاظم کی اس ناصحانہ تقریر کے دوران میں راشد نے زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا تھا بلکہ پوری توجہ سے وہ اپنے ''چاچا جی'' کو سنتا رہا تھا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ چودھری ناظم اور چودھری کاظم میں کیا ''سیٹنگ'' چل رہی ہے۔ چودھری کاظم کے معنی خیز انداز میں خاموش ہونے پر اس نے جلدی سے کہا۔

''نہیں چاچا جی..... ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے۔ میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں ابا جی کی نظر میں خود کو منوا کر رہوں گا۔''

''شاباش پتر جی.....!'' چودھری کاظم نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ''تم اگر چاہو تو اپنی صلاحیتوں کو فوری طور پر منوا سکتے ہو..... یہ اچھا موقع ہے۔''

''وہ کس طرح چاچا جی.....؟'' راشد نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کون سا ایسا موقع ہے، میں جس سے فائدہ اٹھا کر ابا جی کی نظر میں سرخ رُو ہو سکتا ہوں؟''

''میں وہی تو بتا رہا ہوں۔'' چودھری کاظم نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ''دیکھو پتر جی! اس وقت کھیتوں میں ایک فصل تیار کھڑی ہے۔ چند روز بعد اس کی کٹائی شروع ہو جائے گی۔ تم

ابھی جا کر بھائی جی سے ملو اور ان سے کہو کہ اس بار تم اس فصل کی کٹائی اور دیگر امور کی نگرانی خود کرو گے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ بھائی جی خوش ہو کر تمہیں اس بات کی اجازت دے دیں گے اس طرح تمہیں خود کو باصلاحیت ثابت کرنے کا موقع مل جائے گا اور ہاں.....'' اس نے ایک معنی خیز توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس کام کی انجام دہی کے دوران میں اگر تمہیں کوئی دشواری پیش آئے تو کسی سے کوئی ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم سیدھا میرے پاس آ جانا۔ میں تمہاری ہر قسم کی راہنمائی اور مدد کروں گا۔ ٹھیک ہے نا پتر جی.....!''

''بالکل ٹھیک ہے چاچا جی!'' راشد نے تشکر آمیز انداز میں کہا۔ ''میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا لیکن.....!''

راشد نے الجھن زدہ انداز میں، دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ اس عمل سے چاچا جی کی نیت کو کریدنا چاہتا تھا لہٰذا ردِعمل کے طور پر چودھری کاظم نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''لیکن کیا پتر جی.....؟''

راشد نے متذبذب انداز میں جواب دیا۔ ''چاچا جی! میرا ذہن اس بات پر الجھ رہا ہے کہ میرے اس عمل سے ارشد ضرور تشویش میں مبتلا ہو جائے گا اور میری دیکھا دیکھی وہ بھی ابا جی سے ایسی فرمائش کر سکتا ہے۔ اس صورت میں مجھے کیا کرنا ہوگا.....؟''

''اسے کرنے دو، وہ جو بھی کرتا ہے۔'' کاظم نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''تمہیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے میری نظر میں وہ ایک نامعقول لڑکا ہے۔ اگر اس نے تمہارا مقابلہ کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں کسی مدد کے لیے وہ میرے پاس آیا تو میں بڑی خوبصورتی سے اسے ٹال دوں گا۔ میری ساری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں، مجھے تمہارے چھوٹے بھائی ارشد کی کوئی پروا نہیں.....!''

''ہوں.....!'' راشد گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

ان کے درمیان مزید چند باتیں مختلف امور کے حوالے سے ہوئیں پھر راشد اپنے چاچا جی سے رخصت لے کر جلال پور سے نوری آباد واپس آ گیا۔

ارشد اس کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا لہٰذا وہ اسے تنہائی میں لے کر بیٹھ گیا۔

راشد نے شرافت اور دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھوٹے بھائی کو من وعن وہ سب کچھ بتا دیا جو جلال پور میں پیش آیا تھا۔ پوری بات سننے کے بعد ارشد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میرا شک بالکل درست ثابت ہو رہا ہے۔ ضرور ابا جی اور چاچا جی کے درمیان کوئی معاملہ طے شدہ ہے، تم کیا محسوس کرتے ہو راشد؟''

''مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے.....!'' راشد نے تائیدی انداز میں کہا۔

''تم ایک کام کرو راشد.....!'' ارشد آئندہ کی پلاننگ کو واضح کرتے ہوئے بولا۔ ''تم تھوڑے تھوڑے وقفے سے جلال پور کے دو تین چکر لگا لو۔ میں اس کے بعد ادھر کا رخ کرتا ہوں، دیکھتے ہیں، چاچا جی مجھ سے کیا کہتے ہیں۔''

''ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔'' راشد نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آج ہی ابا جی سے بھی بات کرتا ہوں۔''

''ہاں، یہ تو بہت ضروری ہے۔'' ارشد نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''تم پوری سنجیدگی سے اس مشن میں کود جاؤ۔ تھوڑے ہی دنوں میں نتائج سامنے آ جائیں گے۔ ایک بات کے لیے تم بے فکر رہنا.....'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں کسی بھی مرحلے پر، تمہارے مقابلے پر کھڑا دکھائی نہیں دوں گا۔ یہ بات ہمارے درمیان پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ نزہت کے حصول والے معاملے میں مجھے ہارنا اور تمہیں جیتنا ہے۔ میں ابا جی پر یہی ظاہر کروں گا کہ مجھے زمین اور زمینداری سے کوئی لگاؤ یا دلچسپی نہیں ہے البتہ..... چاچا جی کو ٹٹولنے کے لیے میں رسماً جلال پور کے ایک دو چکر ضرور لگاؤں گا۔''

آئندہ روز راشد نے چودھر ناظم سے تنہائی میں ملاقات کی اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

''ابا جی! میں نے کافی سوچ بچار کے بعد ایک فیصلہ کر لیا ہے.....!''

چودھری اپنے بڑے بیٹے کو دلچسپی سے دیکھنے لگا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا فیصلہ کیا ہے پتر جی؟''

''ابا جی!'' وہ بڑے ڈرامائی انداز میں اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اس رات آپ نے ہم دونوں بھائیوں کو اپنے پاس بلا کر بات کی تھی جس میں آپ نے اپنی خواہش کا

خاص طور پر ذکر کیا تھا۔ مجھے نہیں پتا، ارشد آپ کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کیا کیا کچھ کرے گا۔ اس کا معاملہ اس کے ساتھ ہے۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے، اس سے ارشد کا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔''

''وہی تو میں بھی جاننا چاہ رہا ہوں پتر جی۔'' چودھری ناظم نے بڑی رسان سے پوچھا۔

''یہ تو پتا چلے، آخر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے.....''

راشد نے ٹھہر ٹھہر کر نپے تلے الفاظ میں چودھری ناظم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ چودھری کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ بات کے اختتام پر اس نے جذبات سے لبریز آواز میں کہا۔

''شاباش پتر جی.....شاباش! مجھے تم سے یہی امید تھی۔''

وہ بڑے واضح الفاظ میں بیٹے کو مکھن لگا رہا تھا حالانکہ سچی بات یہ تھی کہ اسے راشد سے کبھی ایسی امید نہیں رہی تھی۔ یہ سارا چمتکار تو چودھری ناظم کا تھا جو راشد پر ''محنت'' کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے بڑے بھائی چودھری ناظم کو رپورٹ بھی پیش کر رہا تھا۔

بہر حال، اگلے دن سے راشد نے کھیتوں کی طرف جانا شروع کر دیا۔ وہ اپنے باپ پر یہی ظاہر کر رہا تھا کہ خود کو منوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے لیکن درحقیقت وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا، بادلِ ناخواستہ اور نمائشی تھا۔

چند روز کے بعد ارشد نے جلال پور کا پھیرا لگایا۔ اپنے چاچا جی سے ایک بھرپور ملاقات کی اور آ کر اپنے بڑے بھائی کو بتایا۔

''راشد! چاچا جی ڈبل چال چل رہے ہیں۔ میری نظر میں وہ دوغلے اور منافق ہیں اور ظاہر ہے، وہ یہ سب کچھ ابا جی کے کہنے پر کر رہے ہیں۔ جانتے ہو، انہوں نے رازدارانہ انداز میں مجھ سے کیا کہا ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' راشد نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''بتاؤ، کیا کہا ہے انہوں نے؟''

''وہی.....جو تم سے کہا تھا!'' ارشد نے زہریلے لہجے میں بتایا۔ ''یعنی میں، ارشد ان کی نظر میں تم سے زیادہ لائق اور عقل مند ہوں۔ انہیں تم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کی ساری ہمدردیاں میرے ساتھ ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ میں ہی ابا جی کی نظر میں سرخرو ہو جاؤں لہٰذا مجھے کھیتوں میں کھڑی فصل کی کٹائی اور دیگر امور کو اپنی نگرانی میں کروانا چاہیے تاکہ ابا جی مجھ سے خوش ہو جائیں وغیرہ.....وغیرہ۔''

''اوہ.....'' راشد نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ تو ہو بہو وہی الفاظ ہیں جو انہوں نے مجھ سے کہے تھے.....تو اس کا مطلب ہے.....'' وہ تشویش بھرے انداز میں متوقف ہوا پھر ارشد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''ابا جی کی ہدایت پر، ان کے ساتھ مل کر، چاچا جی ہم دونوں کے ساتھ ڈبل گیم کھیل رہے ہیں۔''

''راشد.....!'' ارشد نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''ابا جی ڈبل گیم کھیلیں یا سنگل، مجھے اس کی قطعاً کوئی پروا نہیں ہے۔ میں نے تمہارے لیے میدان کھلا چھوڑ دیا ہے۔ تم اپنی کوششوں سے ابا جی کی نظر میں خود کو منوالو، میں بس ہاتھ پاؤں ہلا کر خود کو نکما ثابت کرتا رہوں گا لیکن.....'' وہ اچانک رکا، ایک گہری سانس خارج کی اور وارننگ دینے والے انداز میں بولا۔

''لیکن راشد.....ہمارے درمیان جو کچھ طے ہو گیا ہے تم اسے بھولنے کی کوشش نہ کرنا۔ اس آزمائش میں جیتو گے تبھی لیکن تمہاری کامیابی کا پھل ہم دونوں مل بانٹ کر کھائیں گے۔''

''ہاں ہاں.....بالکل۔ یہ تو طے ہے ارشد۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''تم اس سلسلے میں فکر نہ کرو۔ میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

چند روز خیر و عافیت اور امن و امان سے گزر گئے۔ سب کچھ پروگرام کے مطابق، عمل میں آ رہا تھا کہ نوری آباد کی فضا میں ایک دلدوز ''دھماکا'' ہوا۔ ایک اندوہناک خبر نے اچانک نوری آباد کے باسیوں کو افسردہ کر دیا۔

ارشد کو کسی نے قتل کر دیا تھا.....!

✠ ✠ ✠

اس واقعے کی اطلاع ملتے ہی میں جائے واردات پر پہنچ گیا تھا۔ جائے وقوعہ، کھیتوں کے وسیع و عریض سلسلے کے درمیان وہ حصہ تھا جہاں فصل کی کٹائی مکمل ہو چکی تھی اور کٹی ہوئی فصل بنڈلوں کی صورت، ایک بڑے انبار میں وہاں موجود تھی۔ ارشد کی لاش اسی انبار کی اوٹ میں پڑی ملی تھی۔ یہ نوری آباد کا دوسرا رخ تھا یعنی، اگر گاؤں سے نکل کر کھیتوں کی طرف آئیں تو پہلے وہ فصل

کا بلند ڈھیر نظر آتا تھا جس کے عقب میں ارشد کی لاش پائی گئی تھی، اس کے بعد تاحدِ نگاہ کھیتوں کا سلسلہ دکھائی دیتا تھا۔

جب میں جائے وقوعہ پر پہنچا تو وہاں درجن بھر سے زیادہ افراد جمع تھے جن میں راشد بھی شامل تھا البتہ، چودھری ناظم مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں پہلے کمر کے بل جھک کر اور پھر اکڑوں بیٹھ کر ارشد کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

اس کے بدن، پر موسم کی مناسبت سے سادہ لباس تھا جو سینے کے مقام سے سرخ ہو رہا تھا اور یہ سرخی اس کے اپنے ہی خون کی تھی۔ اس کے سینے میں ایک خطرناک خنجر دستے تک پیوست تھا۔ اس کی لاش کو ایک نظر دیکھتے ہی مجھے اندازہ بلکہ یقین ہو گیا کہ زندگی اس سے روٹھ کر کہیں بہت دور جا چکی تھی۔ لاش کے ابتدائی معائنے اور اس کے بدن پر، لباس پر لگے خون کی حالت کو دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ قتل کی وہ واردات رات کے آخری پہر یا زیادہ سے زیادہ آدھی رات کے وقت پیش آئی تھی۔

میں نے بغور اس زمین کا معائنہ بھی کیا جہاں ارشد کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہاں مجھے کسی قسم کی افراتفری کے آثار نظر نہ آئے۔ اس امر نے مجھے ذہنی طور پر الجھا دیا۔ جب کسی شخص کو سینے میں خنجر گھونپ کر موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے تو وہ بڑی خاموشی سے لمبا لیٹ کر جان نہیں دے دیتا بلکہ وہ خنجر کھانے کے بعد تڑپتا پھڑکتا ہے اور.....اس کی اس تڑپن پھڑکن کے واضح آثار بنتے چلے جاتے ہیں لیکن جائے وقوعہ پر ایسے مخصوص آثار مجھے کہیں دکھائی نہیں دیے تھے۔ ارشد کی لاش یوں ''چت'' پڑی تھی جیسے اس نے اپنے قاتل کو دعوت دے کر بلایا ہو اور پھر آنکھیں بند کر کے زمین پر لیٹ گیا ہو، یہ کہتے ہوئے.....اے مہرباں، قدرداں! آؤ.....اور میرے سینے میں خنجر اتار دو.....!

میں نے چادر منگوا کر ارشد کی لاش کو ڈھانپ دیا اور گھوم پھر کر جائے واردات کے اردگرد کا جائزہ لینے لگا اور فصل والے انبار کے قریب ایک چیز کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے چند ٹکڑے تھے۔ میں نے وہ ٹکڑے اٹھا کر گنے، ان میں تین سرخ اور چار نیلے ٹکڑے تھے۔ گویا گزشتہ رات مقتول کے ساتھ وہاں کوئی اور بھی موجود تھا اور یقیناً وہ کوئی عورت یا لڑکی ہی تھی کیونکہ مرد چوڑیاں نہیں پہنتے.....!

میں نے ان سات ٹکڑوں کو خاموشی کے ساتھ اپنی جیب میں رکھ لیا کہ فرصت میں بیٹھ کر

ان کا تفصیلی معائنہ کروں گا۔ چوڑیوں کے وہ ٹکڑے بہت اہم شہادت تھی جس کی مدد سے میں قاتل تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ کسی نے مجھے چوڑیوں کے وہ ٹکڑے اٹھاتے اور جیب میں ڈالتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ میں اس پوائنٹ پر بڑے اطمینان سے تفتیش کرنا چاہتا تھا۔

اِدھر اُدھر کا تفتیشی چکر لگانے کے بعد میں واپس لاش کے پاس آ گیا اور وہاں موجود لوگوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد بہ آواز بلند پوچھا۔

''تم میں سے، سب سے پہلے اس لاش کو کس نے دیکھا تھا؟''

''طفیل نے.....'' راشد جو میرے قریب ہی کھڑا تھا، اس نے جواب دیا۔

''کون طفیل؟'' میں نے راشد سے استفسار کیا۔

''ہمارا ملازم ہے جی۔'' اس نے بتایا۔ ''ادھر کھیتوں میں کام کرتا ہے.....'' پھر اس نے متلاشی نظر ادھر اُدھر دوڑائی اور خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''پتا نہیں، طفیل کہاں چلا گیا، ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ ادھر ہی تھا.....!''

''وہ گاؤں کی طرف گیا ہے چودھری صاحب!'' ایک عمر رسیدہ شخص نے بڑے احترام سے راشد کو آگاہ کیا اور پھر پوچھا۔ ''کیا طفیل کو یہاں بلایا جائے.....؟''

''ہاں ہاں.....اسے فوراً بلاؤ۔'' راشد نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''تھانیدار صاحب اس سے پوچھ گچھ کریں گے، ہوسکتا ہے، قاتل کے بارے میں کوئی سراغ مل جائے.....''

راشد کے چہرے اور حرکات وسکنات سے دل گرفتگی اور افسردگی جھلکتی تھی۔ چھوٹے بھائی کی المناک موت نے اسے اندر باہر سے جیسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بہت زیادہ الجھا ہوا اور پریشان دکھائی دیتا تھا۔ یہ اس کے دل، دماغ اور جسم کا ایک فطری ردِعمل بھی تھا۔

''طفیل کو یہاں بلانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں خود گاؤں کی طرف جا رہا ہوں، بڑے چودھری صاحب سے ملنا بہت ضروری ہے۔'' پھر میں نے راشد سے پوچھ لیا۔ ''چودھری ناظم یہاں نظر کیوں نہیں آ رہے؟''

''ابا جی تو یہ خبر سنتے ہی ڈھے گئے ہیں جناب۔'' راشد نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ میرے ساتھ ہی ادھر آنا چاہتے تھے لیکن کپکپا کر حویلی ہی میں گر پڑے۔ ایک تو ان کی صحت اور اوپر سے اتنا بڑا صدمہ.....!'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر گلوگیر آواز میں بولا۔

''میں نے فوراً ابا جی کو اٹھا کر بستر پر لٹا دیا پھر حکیم صاحب کو بلایا۔ ابا جی کو حکیم صاحب کے حوالے کرنے کے بعد ہی میں نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ پتا نہیں، اب ان کی کیا حالت ہوگی.....!''

اس وقت تک مجھے بالکل خبر نہیں تھی کہ چودھری ناظم اور چودھری کاظم نے راشد وارشد کو سدھارنے کے لیے کیا پروگرام ترتیب دے رکھا تھا اور یہ کہ ان دونوں بھائیوں نے حالات سے نمٹنے کے لیے کیا حکمتِ عملی اپنا رکھی تھی۔ وہ میرے لیے ایک سیدھی سادی قتل کی واردات تھی جس کی میں ابتدائی تفتیش کر رہا تھا۔

میں نے تسلی دینے والے انداز میں راشد کا کندھا تھپتھپایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''حوصلہ کرو راشد! خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو، تمہیں اس موقع پر بہت ہمت سے کام لینا ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی حویلی چلوں گا۔ بس ذرا، تمہارے بھائی کی لاش کا بندوبست کر لوں۔''

''بندوبست.....!'' اس نے الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ ''آپ ارشد کی لاش کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

''موقع کی کارروائی اس وقت مکمل ہوگی برخوردار جب میں مقتول کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دوں گا۔'' میں نے نرم لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

اس کام کے بعد ہی ہم حویلی کی طرف جا سکیں گے.....!''

''پوسٹ مارٹم.....!'' وہ متوحش نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''یعنی آپ ارشد کی لاش کو چیر پھاڑ کے لیے اسپتال بھجوائیں گے؟''

''ہاں، تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن اس کی کیا ضرورت ہے تھانیدار صاحب!'' وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔ ''ایک تو وہ جان سے گیا، اوپر سے اس کی لاش کی بے حرمتی ہوگی.....!''

''پوسٹ مارٹم بہت ضروری ہے راشد!'' میں نے بڑی رسان سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''اس سے لاش کی بے حرمتی نہیں ہوگی بلکہ قانون کو تمہارے بھائی کے قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ یہ کوئی طبعی یا حادثاتی موت نہیں بلکہ کسی شخص نے دیدہ و دانستہ ارشد کو

قتل کیا ہے۔''

راشد کو سمجھانے میں مجھے تھوڑی مشکل تو پیش آئی تاہم میں نے موقع کی ضروری کارروائی مکمل کرتے ہوئے ارشد کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوادیا۔ موقع پر موجود لوگوں سے میں نے پوچھ گچھ کی تو پتا چلا، ان میں سے کوئی بھی اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لہٰذا میں راشد کے ساتھ اس کی حویلی آ گیا۔ راشد نے راستے ہی میں ایک بندے کی ڈیوٹی لگادی تھی کہ وہ طفیل کو پکڑ کر حویلی ہی میں لے آئے تاکہ میں اس سے ضروری سوال و جواب کرسکوں۔

میں چودھری ناظم کی حویلی میں پہلی مرتبہ آیا تھا۔ اس سے پہلے ایک دو بار اس سے ملاقات تو ہوئی تھی لیکن اس کے دولت خانے پر آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ چودھری ناظم کے بارے میں مجھے مکمل معلومات حاصل تھیں خصوصاً اس کی شادیوں وغیرہ کے حوالے سے مگر اس کی حویلی میں قدم رکھنے کے بعد پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وہ کتنا اکیلا اور تنہا تھا۔ اتنی بڑی حویلی میں مالکان کی تعداد صرف تین تھی، جو گھٹ کر اب دو رہ گئی تھی، یعنی چودھری ناظم اور اس کا بڑا بیٹا چودھری راشد۔ بڑے افسوس اور دکھ کا مقام تھا..... بہرحال، یہ ایک حقیقت تھی!

راشد مجھے چودھری ناظم کے کمرے میں لے گیا جہاں چودھری کے علاوہ حکیم وارثی اور چند عزیز موجود تھے۔ یہ چودھری ناظم کے وہ رشتے دار تھے جن کا تعلق چودھری سے بہت دور کا تھا اور وہ آس پاس کے گاؤں دیہات میں رہتے تھے۔ ارشد کے قتل کی خبر ان تک پہنچ چکی تھی اور وہ یہاں آ گئے تھے۔ چودھری ناظم آنکھیں بند کیے ایک شاہانہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

میرے اشارے پر حکیم یاسین وارثی کے علاوہ تمام لوگ کمرے سے نکل گئے۔ راشد نے بیٹھنے کے لیے مجھے ایک کرسی پیش کی اور میں یاسین وارثی کے قریب بیٹھ گیا۔ حکیم صاحب کے چہرے پر مجھے گہری فکرمندی نظر آئی تاہم میرے استفسار پر اس نے مجھے تسلی بھرا جواب دیا۔

''زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے تھانیدار صاحب۔ میں نے چودھری جی کو دوا کھلا دی ہے، دو تین گھنٹے کے بعد یہ مکمل ہوش میں آ جائیں گے.....!''

''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس وقت چودھری صاحب بے ہوش ہیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے حکیم یاسین کی طرف دیکھا۔

وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ''آپ اسے بے ہوشی کی کیفیت نہ سمجھیں بلکہ یہ تصور کریں کہ چودھری صاحب اس وقت گہری نیند میں ہیں اور یہ سب میری دوا کے اثرات ہیں۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''جوان بیٹے کی ناگہانی موت نے چودھری صاحب کے ذہن اور دل کو بری طرح متاثر کیا ہے جناب۔ اگر میں اس وقت انہیں سکون کی دوا نہ دیتا تو ان کے دماغ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ یہ کوئی معمولی صدمہ نہیں ہے تھانیدار صاحب۔ پتا نہیں، دونوں بھائیوں نے کیسی قسمت پائی ہے، تین سال پہلے چودھری کاظم کا جوان جہان بیٹا رب نواز قتل ہو گیا اور اب چودھری ناظم کا بیٹا ارشد.....!''

حکیم یاسین وارثی نے ایک گہری سانس خارج کی پھر وہ پسران چودھریاں کے قتل کی کسی تفصیل میں جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میری بروقت مداخلت نے اسے روک دیا۔ میں ماضی کے کسی قصے کو سننے کے موڈ میں نہیں تھا کیونکہ رب نواز کے قتل والا واقعہ میرے علم میں تھا لہٰذا اس سے پہلے کہ حکیم اس داستان کی ابتدا کرتا، میں نے جلدی سے پوچھ لیا۔

''تو اس کا مطلب ہے، دو تین گھنٹے کے بعد چودھری صاحب ہوش میں آ جائیں گے اور میں ان سے بات چیت کر سکوں گا.....؟''

''نہیں، تھانیدار صاحب!'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ میرا اندازہ ہے کہ وہ دو تین گھنٹے کے بعد ہوش میں آ جائیں گے لیکن اس مدت میں گھنٹے، آدھے گھنٹے کا اضافہ بھی ہو سکتا ہے اور جہاں تک ان سے پوچھ گچھ کا تعلق ہے تو.....'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میرے خیال میں، ہوش میں آنے کے بعد بھی چودھری صاحب کو ذہنی آرام کی ضرورت ہوگی۔ آپ شام سے پہلے ان سے سوال و جواب نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں چودھری صاحب سے ملاقات کے لیے اب رات ہی کو آؤں گا۔'' میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا پھر راشد کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''آؤ، کسی دوسرے کمرے میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں، یہاں چودھری صاحب کو آرام کرنا چاہیے۔''

راشد نے بڑی فرماں برداری سے اثبات میں گردن ہلائی اور مجھے لے کر دوسرے

کمرے میں آ گیا۔ اسی لمحے راشد کے بھیجے ہوئے بندے نے طفیل کو حویلی پہنچا دیا۔ میں چودھری راشد کو چھوڑ کر طفیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

طفیل کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہو گی۔ اکہرا بدن، پستہ قامت اور رنگ گندمی، وہ دبلا پتلا ہونے کے باوجود بھی چہرے مہرے سے محنتی اور جفاکش نظر آتا تھا۔ رسمی کلمات کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آ گیا اور اس سے چودھری ارشد کی لاش کی دریافت کے بارے میں سوال کیا۔ طفیل ان کھیت مزدوروں میں سے ایک تھا جو ان دنوں فصل کی کٹائی میں مصروف تھے۔ کٹائی کا کام اب تقریباً مکمل ہونے کے قریب تھا۔ صرف دو، تین کھیتوں میں فصل کھڑی نظر آتی تھی جو کٹنے والی تھی۔ راشد نے بڑی ذمے داری کا ثبوت دیتے ہوئے کام کو تقریباً نمٹا دیا تھا۔

طفیل نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''جناب! میں تو روزانہ کی طرح آج بھی اپنی درانتی اٹھا کر اُدھر کھیتوں میں گیا تھا۔ بس، ایک آدھ دن ہی کا کام باقی رہ گیا تھا اسی لیے میں آج صبح کچھ زیادہ جلدی گھر سے نکل گیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا، وہاں چھوٹے چودھری جی کی لاش دیکھنی پڑے گی.....!''

بھرائی ہوئی آواز میں اس نے جملہ نامکمل چھوڑا تو میں نے پوچھا۔ ''فصل کی کٹائی کے لیے تمہارے علاوہ بھی کچھ لوگ کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ کیا آج صبح وہ تمہارے ساتھ نہیں گئے تھے؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''آج کل ہم کل چھ بندے فصل کی کٹائی میں لگے ہوئے ہیں لیکن میری ہمیشہ سے یہ عادت ہے کہ گھر سے اکیلا ہی نکلتا ہوں۔ کبھی ان سے پہلے اور کبھی بعد میں کھیتوں میں پہنچتا ہوں آج میں چونکہ خاصا جلدی گھر سے نکلا تھا اس لیے ریاست، منظور، صدیق، معراج اور ساجد سے پہلے میں وہاں پہنچ گیا تھا۔''

''تم وہاں پہنچے تو کیا دیکھا؟'' میں نے طفیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے جواب دینے سے پہلے ایک جھرجھری لی اور بولا۔ ''میں جیسے ہی فصل والے اونچے ڈھیر کے پیچھے پہنچا، چودھری ارشد کی لاش مجھے نظر آئی۔ وہ بالکل ساکت زمین پر پڑے تھے اور ان کے سینے میں ایک خطرناک خنجر گھسا ہوا تھا۔ جسم سے نکلنے والے خون نے ان کے کپڑوں کو

بھی بھگو دیا تھا۔ میں یہ منظر دیکھ کر ڈر گیا..... سچ پوچھیں تو میرے دماغ نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چھوٹے چودھری جی کو یوں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ میں کافی دیر تک ساکت و جامد وہیں کھڑا رہا پھر جب میرے حواس نے کام کرنا شروع کیا تو میں نے واپس گاؤں کی طرف دوڑ لگا دی.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔

''راستے ہی میں مجھے ریاست، ساجد اور صدیق مل گئے۔ انہوں نے مجھے یوں گھبراہٹ میں بھاگتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی پریشان ہوگئے۔ انہوں نے مجھے روک کر اس بوکھلاہٹ کا سبب دریافت کیا۔ میں نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ وقوعہ کی جانب بڑھ گئے اور میں بڑے چودھری صاحب کو اطلاع دینے حویلی آ گیا۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا، وہ چودھری صاحب جانتے ہیں۔'' بات ختم کر کے اس نے چودھری راشد کی طرف دیکھا۔

میں نے طفیل سے پوچھا۔ ''جب آج صبح تم نے جائے وقوعہ پر چودھری ارشد کی لاش دیکھی تو تمہیں اس کے آس پاس بھی کوئی نظر آیا تھا؟''

''نہیں جناب۔'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ''وہاں اور کوئی بھی نہیں تھا۔''

''کوئی لڑکی..... یا کوئی عورت.....؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہ کوئی عورت، نہ کوئی مرد.....'' وہ پورے یقین سے بولا۔

میں نے چودھری ارشد کی لاش کا بغور جائزہ لیا تھا اور اس جائزے میں ایک اہم نکتہ ابھر کر سامنے آیا تھا وہ یہ کہ ارشد کو حالتِ غفلت میں قتل کیا گیا تھا۔ اگر وہ بہ قائمی ہوش و حواس ہوتا تو سینے میں خنجر کھانے کے بعد سے لے کر موت کی آغوش میں جانے تک کی ''تاریخ'' جائے وقوعہ پر ضرور ''رقم'' ہوتی۔ جس شخص کے سینے میں خنجر گھونپا جائے وہ یوں چپ چاپ، خاموش لیٹ کر جان نہیں دیتا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ جب ارشد کو موت کے گھاٹ اتارا گیا اس وقت وہ یا تو بے ہوش تھا یا پھر گہری نیند میں تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس تلخ حقیقت سے پردہ اٹھا سکتی تھی جس کے لیے مجھے کم از کم چوبیس گھنٹے انتظار کرنا تھا۔

دوسرا اہم نکتہ جو جائے وقوعہ سے میں نے حاصل کیا تھا اور اسی کی روشنی میں، میں نے طفیل سے، کسی عورت کی وہاں موجودی کے حوالے سے سوال کیا تھا وہ..... ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے

سات ٹکڑے تھے۔ وہ ٹکڑے اس بات کا بیّن ثبوت تھے کہ جائے وقوعہ پر کوئی عورت بھی موجود رہی تھی، ارشد کی موت سے قبل یا اس کی موت کے بعد.....اور یا پھر اس کی معیت میں!

میں نے ان دونوں نکات کا ذکر ابھی کسی سے نہیں کیا تھا۔ میں دوبارہ طفیل کی جانب متوجہ ہو گیا کیونکہ اس سے ایک اور اہم بات پوچھنا ضروری تھا۔ ارشد کی لاش پر پائے جانے والے خون کی حالت سے میں نے اندازہ قائم کیا تھا کہ اس کی موت گزشتہ شب آدھی رات سے لے کر رات کے آخری پہر کے دوران میں واقع ہوئی تھی یعنی لگ بھگ رات بارہ بجے سے صبح چار بجے تک لہٰذا طفیل سے یہ پوچھنا نہایت ہی اہم تھا کہ وہ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچا تھا۔

ایک راز کی بات بتاتا چلوں کہ پولیس کی نظر میں اس شخص کی بڑی اہمیت ہوتی ہے جو کسی سنگین واقعے کو سب سے پہلے دیکھنے کا دعویدار ہوتا ہے۔ اصولی طور پر پولیس اس اطلاع کنندہ شخص کو بھی مشکوک افراد کی فہرست میں شامل کر لیتی ہے اور دورانِ تفتیش میں اس وقت تک ایسے شخص کو ایک لمحے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کرتی جب تک اس کی ذات شک و شبہے سے بالاتر ثابت نہیں ہو جاتی۔ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے طفیل سے پوچھا۔

''ذرا سوچ کر بتاؤ طفیل، تم آج صبح کتنے بجے جائے وقوعہ.....میرا مطلب ہے، اس جگہ پہنچے تھے جہاں پر تم نے چودھری ارشد کی لاش پڑی دیکھی تھی؟''

''میرا خیال ہے، اس وقت صبح کے سات بجے ہوں گے۔'' طفیل نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''تم گھر سے نکلنے کے بعد سیدھے کھیتوں ہی کی طرف گئے تھے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اور کہیں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''گھر میں تمہارے علاوہ اور کتنے افراد ہیں؟''

''میری بیوی زلیخا اور دو بچے.....!''

''جب تم گھر سے روانہ ہوئے تو ان میں سے کون کون بیدار ہو چکا تھا؟''

''دونوں بچے تو سوئے ہوئے تھے جناب۔'' طفیل نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے زلیخا کو ناشتے وغیرہ کے لیے جگا دیا تھا۔ اس نے میرے لیے کھانے پینے کا بندوبست کیا

اور میں ناشتا کر کے گھر سے نکل آیا تھا۔''

''اس کا مطلب ۔ہے، تمہاری بیوی زلیخا اس بات کی گواہی دے سکتی ہے کہ آج صبح تم سات بجے سے چند منٹ پہلے گھر سے نکلے تھے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔'' کیونکہ تمہارے گھر سے کھیتوں کے اس حصے تک پہنچنے میں چند منٹ ہی لگتے ہیں۔''

''زلیخا ضرور اس بات کی گواہی دے سکتی ہے جناب۔'' وہ پُر وثوق انداز میں بولا۔

''لیکن.....!''

''لیکن کیا؟'' وہ متذبذب انداز میں رکا تو میں نے پوچھ لیا۔

''لیکن جناب.....میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کسی حوالے سے میری ذات پر شک کر رہے ہیں.....!'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات ذہن میں رکھو کہ پولیس کی تفتیشی گاڑی ہمیشہ شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ جب تک کسی کیس کا اصل مجرم پولیس کے ہتھے نہیں چڑھ جاتا، وہ ہر اس شخص پر شک کرتی رہتی ہے جو کسی بھی حوالے سے مقتول یا متاثرہ شخص سے تعلق رکھتا ہو لیکن.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''.....لیکن اگر تم چودھری ارشد کے قتل میں کسی بھی زاویے سے ملوث نہیں ہو تو پھر تمہیں گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔''

''میں ذرا بھی پریشان یا فکر مند نہیں ہوں تھانیدار صاحب۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں ساری رات اپنے گھر میں موجود تھا اور جب صبح گھر سے نکلا تو زلیخا نے خود مجھے رخصت کیا تھا۔ آپ زلیخا سے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میں جب ضرورت محسوس کروں گا، تمہاری بیوی سے ملاقات کرنے آ جاؤں گا۔ اب تم آرام سے گھر جاؤ اور اگر تمہیں کسی ضروری کام سے نوری آباد سے باہر جانے کی ضرورت پیش آئے تو تھانے میں اطلاع دیے بغیر تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا.....؟''

''جی.....سمجھ گیا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

اس کے انداز اور چہرے کے تاثرات سے مجھے یہ سمجھنے میں دشواری محسوس نہیں ہوئی تھی کہ وہ واقعی میری بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ پھر وہ مجھے اور چودھری راشد کو سلام کر کے وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں راشد کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''راشد! میرے تجربے کے مطابق، تمہارے بھائی کی موت آدھی رات کے بعد کسی وقت واقع ہوئی ہے۔ اس حویلی میں تم تینوں کے سوا اور کوئی نہیں رہتا۔ کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ آدھی رات کے وقت ارشد کس کے ساتھ حویلی سے باہر گیا تھا؟''

''میں اس کے حویلی سے باہر جانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''پچھلی رات کوئی دس بجے تک ہم حویلی کے اندر ایک ساتھ ہی تھے، پھر ہم اپنے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔ اس کے بعد کا مجھے پتا نہیں.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''جب آج صبح طفیل، ارشد کے قتل کی اطلاع لے کر حویلی پہنچا تو میں تھوڑی دیر پہلے ہی سو کر اٹھا تھا۔ میں یہ خبر سن کر اباجی کے پاس گیا اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ میرے ساتھ جائے وقوعہ پر جانے کے لیے تیار ہوئے لیکن پھر وہ کپکپا کر گر گئے.....اس کے بعد ان کی جو حالت ہوئی.....اور اب تک وہ جس کیفیت میں ہیں وہ سب آپ کے سامنے ہے۔''

''دیکھو راشد!'' میں نے ہمدردانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔ ''تمہارے چھوٹے بھائی کی المناک موت کا مجھے بھی بڑا دکھ ہے لیکن میں اپنے فرض سے بھی مجبور ہوں لہٰذا یہ تفتیش تو جاری رکھنا ہی ہوگی لیکن میرا یہ تم سے وعدہ ہے.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ جلد از جلد تمہارے بھائی کے قاتل کو گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچاؤں گا لیکن اس کے لیے تمہیں مجھ سے پورا تعاون کرنا ہوگا.....!''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں جناب۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ وہ نامراد پہلی فرصت میں عبرت ناک انجام سے دوچار ہو جس نے اتنی سفاکی سے ارشد کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔''

''بڑے چودھری صاحب سے تو اس وقت بات ہوگی جب وہ مکمل طور پر ہوش و حواس

میں آ جائیں گے۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''فی الحال تم مجھے بتاؤ کہ ارشد کی دشمنی کس سے تھی؟''

''جناب! میرے خیال میں، اس کا ایسا کوئی دشمن ہیں جو اس کی جان لینے کے بارے میں سوچ سکے۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''اس کے ملنے والے جن لوگوں سے میں واقف ہوں ان میں سے تو کوئی اتنی جرأت نہیں کر سکتا۔''

''اور جن لوگوں سے تم واقف نہیں ہو، ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے.....!''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ایسا خطرناک کام کوئی دوست نہیں کر سکتا، بعض اوقات دوستوں کے جتھے میں کوئی ایک آدھ ایسا دشمن بھی چھپا ہوتا ہے جو وقت اور موقعے کا انتظار کرتا رہتا ہے پھر جیسے ہی اس کا بس چلتا ہے، وہ بڑی صفائی سے اپنا کام دکھا کر ایک طرف ہو جاتا ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''راشد! کیا تم کسی ایسے شخص کی نشاندہی کر سکتے ہو؟''

وہ چند لمحات تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب..... میں ایسے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔''

''کسی لڑکی وغیرہ سے ارشد کا کوئی چکر چل رہا تھا؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلا دی۔ ''نہیں جناب۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ آپ نے طفیل سے پوچھ گچھ کرتے ہوئے بھی کسی لڑکی یا عورت کا تذکرہ کیا تھا۔ یہ کیا معاملہ ہے جناب.....؟''

''معاملہ کافی گمبھیر ہے راشد!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر میرے سوال کا جواب دو..... پھر میں بتاؤں گا کہ میرے ذہن میں کیا ہے.....!''

اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نمودار ہوئے پھر وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''لڑکی کے حوالے سے میرے ذہن میں صرف ایک ہی نام ہے جناب لیکن ارشد نے بڑے واضح الفاظ میں اپنی عدم دلچسپی کا اظہار کر دیا تھا۔ اسے نزہت سے کوئی مطلب نہیں تھا۔''

''یہ نزہت کون ہے؟'' میرے کان کھڑے ہو گئے۔

واضح رہے کہ اس وقت تک مجھے ان حالات و واقعات کی بالکل خبر نہیں تھی جو اس کہانی کے ابتدائی صفحات میں، میں نے خاصی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ میرے اس چونکے ہوئے بے ساختہ سوال کے جواب میں راشد نے بتایا۔

''نزہت میرے چاچا چودھری کاظم کی بیٹی ہے جناب جوادھر موضع جلال پور میں رہتے ہیں.....''

''اچھا اچھا.....'' میں نے جلدی سے کہا پھر تصدیقی لہجے میں پوچھ لیا۔ ''یہ چودھری کاظم وہی ہے نا، تین سال پہلے جس کے بیٹے رب نواز کا قتل ہو گیا تھا؟''

''جی ہاں..... بالکل.....!'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

''ہاں..... اب بتاؤ۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''یہ نزہت کا کیا قصہ ہے؟''

''جناب! یہ بہت ہی لمبی چوڑی کہانی ہے جو ابھی تک چل رہی ہے۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''بلکہ یوں سمجھیں کہ یہ ایک دلچسپ کھیل ہے جس میں ابا جی کے علاوہ میرے مطابق، چاچا جی بھی شامل ہیں۔ اگر میں نے یہ قصہ شروع کر دیا تو سنتے سنتے آپ کو شام بھی ہو سکتی ہے۔''

''تم وقت اور میری ہمت و برداشت کی پروا نہ کرو راشد!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں مختصر اور طویل کہانیاں سننے کا عادی ہوں اور ان میں سے کام کی باتوں کو الگ کرنے کا بھی مجھے وسیع تجربہ ہے۔ اس لیے.....'' میں نے تھوڑا سا توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس لیے تم اللہ کا نام لے کر شروع ہو جاؤ.....!''

اور وہ اللہ کا بندہ واقعی اللہ کا نام لے کر شروع ہو گیا۔

آئندہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں راشد نے مجھے اس ڈرامے کی حقیقت سے تفصیلاً آگاہ کر دیا جس کی بنیاد پر میں نے اس کہانی کا آغاز کیا تھا۔ یہاں پر ایک بات کا میں اضافہ کرتا چلوں کہ بعد ازاں جب میری اس موضوع پر، چودھری ناظم اور چودھری کاظم سے ملاقات اور بات چیت ہوئی تو

''پلاٹ'' کے معمولی سے فرق کے ساتھ انہوں نے چودھری راشد کے بیان کی تصدیق کر دی تھی۔

اپنی بات کے اختتام پر اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔''جی ملک صاحب! اب آپ پر بھی لازم ہے کہ میرے سوال کا جواب دیں؟''

''بالکل لازم ہے۔'' میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔''مجھے جائے وقوعہ سے ایک ایسی چیز ملی ہے جس کی بنا پر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اس حادثے کے وقت چودھری ارشد کے ساتھ کوئی لڑکی یا عورت بھی موجود تھی.....!''

''کون سی چیز ملی ہے آپ کو.....؟'' وہ چوکنا نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اسی سے پوچھ لیا۔''کیا فصل کی کٹائی میں مردوں کے شانہ بشانہ عورتیں بھی کھیتوں میں کام کرتی رہی ہیں؟''

میں اپنے اندازے میں غلطی کے صفر فیصد امکان کو بھی ختم کرنا چاہتا تھا۔ یہ اچھوتا سوال اسی ذیل میں تھا۔ راشد نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''عام طور پر تو ایسا ہی ہوتا ہے جناب کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی کھیتوں میں مختلف امور نمٹاتی نظر آتی ہیں لیکن میں نے خاص طور پر فصل کی کٹائی کے سلسلے میں کسی عورت سے کوئی کام نہیں لیا۔ یہ سارا کام انہی نصف درجن مردوں کا کارنامہ ہے۔''

میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''اس کا مطلب ہے، میرا قائم کردہ اندازہ بالکل درست ہے۔ گزشتہ رات چودھری ارشد کے ساتھ وہاں کوئی لڑکی یا عورت بھی موجود تھی اور.....'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''.....اور اس بات کا ثبوت یہ ہے.....!''

میں نے بات ختم کرتے ہی چوڑیوں کے ٹکڑے اپنی جیب سے نکال کر چودھری راشد کے سامنے رکھ دیے۔ ہم دونوں کے بیچ میں ایک چھوٹی میز رکھی تھی اور ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے میں نے وہیں رکھے تھے۔

چودھری راشد نے حیرت بھری نظر سے ان سرخ اور نیلے ٹکڑوں کو دیکھا پھر الجھن زدہ انداز میں بولا۔''کیا یہ ٹکڑے آپ کو جائے وقوعہ سے ملے ہیں؟''

''تو کیا میں غلط بیان کروں گا.....؟''

''نہیں نہیں.....'' وہ جلدی سے بولا۔''میرا یہ مطلب نہیں تھا.....!''

''پھر کیا مطلب تھا تمہارا؟''

''دراصل.....میں بھی تو وہاں موجود تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''میں نے آپ کو یہ ٹکڑے اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیے مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کس وقت آپ کے پاس پہنچ گئے اور.....اور آپ نے تب ان کے بارے میں کوئی بات کیوں نہیں کی.....؟''

''جائے واردات پر درجن بھر افراد موجود تھے۔'' میں نے نیلے اور سرخ ٹکڑوں کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''اس قسم کے معاملات مجمع میں نہیں بلکہ تنہائی میں اٹھائے جاتے ہیں، بصورت دیگر تفتیش کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہونے کے امکان روشن ہو جاتے ہیں.....'' میں نے تھوڑا توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے مزید کہا۔

''یہ دیکھو، ان ٹکڑوں سے دو چوڑیاں مکمل ہو گئیں۔ ایک نیلی اور ایک لال۔ تین لال اور چار نیلے ٹکڑے یہ کہانی سناتے ہیں کہ یہ دونوں چوڑیاں جائے وقوعہ پر ہی ٹوٹی تھیں، مطلب جائے وقوعہ پر، پچھلی رات چودھری ارشد کے ساتھ کوئی لڑکی یا عورت بھی موجود تھی جس نے اپنی کلائی میں نیلی اور لال چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ اب تو تم میری بات کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ گئے ہو گے چودھری راشد.....!''

وہ گمبھیر سوچ میں ڈوب گیا پھر الجھن زدہ انداز میں بولا۔''مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ ارشد کا کسی لڑکی یا عورت کے ساتھ کوئی چکر نہیں تھا اور جہاں تک نزہت کا تعلق ہے تو اول تو وہ ارشد کو پسند ہی نہیں کرتی.....اگر ان کی باہمی پسندیدگی کو فرض بھی کر لیں تو یہ ممکن نہیں کہ وہ آدھی رات کو جلال پور سے نوری آباد آئی ہو گی۔'' وہ لمحاتی توقف کے بعد نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

''نزہت کسی بھی قیمت پر یہاں ارشد کے پاس نہیں آ سکتی.....کبھی نہیں!''

''تو پھر وہ کوئی دوسری لڑکی ہو گی.....ہوں؟''

''ہاں، یہی ہو سکتا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''لیکن کون.....؟''

''وہ جو کوئی بھی ہے، میں بہت جلد اس تک پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے ٹھوس الفاظ میں کہا۔''کیونکہ وہی مجھے بتا سکتی ہے کہ پچھلی رات ادھر کھیتوں میں، چودھری ارشد کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے!''

''میں بھی یہی چاہوں گا کہ آپ جلد از جلد اس لڑکی تک پہنچ جائیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔''اس سلسلے میں اگر میں کچھ کر سکتا ہوں تو حکم کریں ملک صاحب!''

''تمہارے لیے اگر کوئی کام نکلا تو میں ضرور بتاؤں گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''فی الحال تم یہ بتاؤ کہ نزہت کس کو پسند کرتی ہے؟''

''جی.....!'' اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔''تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ نزہت ارشد کو پسند نہیں کرتی۔ وہ کسی بھی قیمت پر ارشد کے پاس نہیں آ سکتی۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ تم جانتے ہو، نزہت کس کو پسند کرتی ہے؟''

وہ بری طرح گڑبڑا گیا پھر لنگڑی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''جی..... یہ تو مجھے نہیں پتا کہ نزہت..... کس کو پسند کرتی ہے لیکن..... میں نے کبھی اس کے منہ سے ارشد کی تعریف نہیں سنی اور چاچا جی کی نظر میں ارشد کا ریکارڈ تسلی بخش نہیں تھا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر تھوک نگلنے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ بات آپ سمجھ لیں کہ چاچا جی کی حویلی میں وہی ہوتا ہے جو ان کی مرضی ہو۔ اگر وہ کسی کو پسند نہیں کرتے تو پھر ان کے گھر کا کوئی آدمی، اس شخص کو پسند نہیں کر سکتا۔ میں نے اسی بنا پر کہا تھا کہ نزہت، ارشد کو پسند نہیں کرتی.....!''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔''اس بات کا میں خود پتا لگا لوں گا کہ نزہت کس کو پسند کرتی ہے اور کل رات، ادھر کھیتوں میں ارشد کے ساتھ کون تھی!'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر چودھری راشد سے کہا۔

''تم مجھے کسی ایسے شخص کے بارے میں بتاؤ جو ارشد سے بہت قریب تھا، یعنی اس کا کوئی گہرا دوست.....؟''

''ارشد کا زیادہ اٹھنا بیٹھنا ملک امین کے بیٹے ملک نوید کے ساتھ تھا۔'' چودھری راشد نے جواب دیا۔

''کیا ملک نوید ادھر نوری آباد ہی کا رہنے والا ہے؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔''یہ پہلوانوں کا خاندان ہے جناب۔ ملک

امین تو پہلوانی سے ریٹائر ہو چکا ہے لیکن اس نے ابھی تک اکھاڑا نہیں چھوڑا۔ اپنے دونوں بیٹوں اور دیگر شہ زوروں کے ساتھ وہ بھی اکھاڑے میں نظر آتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں ملک نوید سے ملاقات کرلوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''کیا نوید کو، ارشد کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی خبر ہوگئی ہے؟''

''جناب! ارشد کے قتل والی خبر تو جنگل کی آگ کے مانند پورے نوری آباد میں اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں پھیل چکی ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ نوید کو پتا نہ چلا ہو لیکن.....'' وہ الجھن زدہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ کر رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''لیکن نوید ابھی تک مجھے کہیں نظر نہیں آیا!''

''وہ جب بھی نظر آئے یا تمہاری اس سے ملاقات ہو تو تم اسے سیدھا میرے پاس تھانے میں بھیجنا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے، ملک نوید سے پوچھ گچھ مفید ثابت ہوگی۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب!'' وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔ ''میں نوید کو آپ کے حکم کے بارے میں بتادوں گا۔''

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔'' میں نے چودھری راشد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''رات میں دوبارہ چکر ماروں گا۔ اس وقت تک تمہارے ابا جی بھی بات چیت کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس دوران میں اگر تمہیں ارشد کے قتل کے سلسلے میں کوئی اہم بات پتا چلے تو فوراً مجھے بتانا۔''

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلا کر میرے حکم کی تعمیل کا یقین دلایا پھر پوچھا۔

''ملک صاحب! ارشد کی لاش کب تک ہمارے حوالے کردی جائے گی؟''

''میرے محتاط اندازے کے مطابق کل دوپہر تک مقتول کی لاش اسپتال سے واپس آ جائے گی۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ شام تک لاش تم لوگوں کے حوالے کر دی جائے گی۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور حویلی سے نکل آیا۔

✠ ✠ ✠

جو حالات اس وقت میرے سامنے تھے ان میں اگر چودھری راشد کا قتل ہو جاتا تو قاتل کے سلسلے میں فوری طور پر میرا دھیان چودھری ارشد کی طرف جاتا۔ اگر چہ ان دونوں بھائیوں کے بیچ ایک خاموش زبانی معاہدہ ہو چکا تھا لیکن اس آزمائش میں چونکہ راشد کی کامیابی کے امکانات روشن تھے لہٰذا راشد کے حوالے سے ارشد کے دل و دماغ میں حسد کی بیداری عین فطری عمل ہوتا اور انسان کسی فطری عمل کے زیر اثر اپنی نفسیات کے ہاتھوں کچھ بھی کر بیٹھنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن یہاں پر اس کے برعکس پیش آیا تھا۔

چودھری راشد نے اپنی کارکردگی سے چودھری ناظم پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اس گاؤں کا آئندہ چودھری بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس کا چاچا چودھری کاظم بھی اس سے بہت خوش تھا کیونکہ وہ اسی کی بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کر کے اپنے باپ کی نگاہ میں سرخ رُو ہو رہا تھا۔ چودھری کاظم کے اطمینان کا مطلب یہ تھا کہ وہ دل سے چودھری راشد کو اپنا داماد بنانے پر تیار ہے۔ اس صورتِ حال میں چودھری راشد کی منزل کی طرف جانے والا راستہ بڑا صاف و شفاف دکھائی دیتا تھا لہٰذا اسے اس راہ میں سے کوئی پتھر یا کانٹا چننے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بادی النظر میں، اس کے ارشد کے قتل میں ملوث ہونے کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا تھا لہٰذا یہ کیس قدرے پیچیدہ ہو گیا تھا۔

میں نے راشد کو کریدنے کی خاطر ہر زاویے سے سوال کر کے دیکھ لیا تھا لیکن وہ ارشد کے ساتھ کسی لڑکی کے تعلق کا علم نہیں رکھتا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ جانتا ہو اور دانستہ مجھ سے چھپا رہا ہو۔ ایسی باتیں چھپی نہیں رہ سکتیں۔ وہ نہ بتاتا تو مجھے کہیں اور سے پتا چل جاتا۔ ویسے میں بھی اس بات سے متفق تھا کہ نزہت، ارشد سے ملاقات کے لیے آدھی رات کو موضع جلال پور سے چل کر موضع نوری آباد کے کھیتوں تک نہیں آ سکتی تھی.....!

میں شام کو دوبارہ چودھری ناظم سے ملاقات کے لیے روانہ ہو ہی رہا تھا کہ ملک نوید مجھ سے ملنے آ گیا۔ چودھری راشد کے مطابق ملک نوید مقتول ارشد کے بہت قریب تھا۔ میں نے اسی لیے نوید کو تھانے بلایا بھی تھا کہ اس قتل پر روشنی پڑ سکے۔

ملک نوید کی عمر پچیس کے قریب رہی ہو گی۔ وہ ایک گورا چٹا اور قد آور نوجوان تھا۔ صحت

اچھی اور پہلوانی کی بدولت بدن مائل بہ فربہی۔ بعد میں نوید کے بڑے بھائی ملک جاوید اور ان کے باپ ملک امین کو دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ فربہی ان کا خاندانی مسئلہ تھا، اس میں اکھاڑے اور پہلوانی کا زیادہ عمل دخل نہیں تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد، میں نے ملک نوید سے پوچھا۔ ''تم آج صبح سے کہاں ہو، تمہارا اتنا گہرا دوست قتل ہو گیا اور تم پتا نہیں، کہاں غائب ہو؟''

وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے بھی تھوڑی دیر پہلے ہی ارشد کے قتل کا پتا چلا ہے جناب.....اور میں سیدھا آپ کے پاس آ گیا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے، تم ادھر نوری آباد میں موجود نہیں تھے؟''

''جی، آپ کا اندازہ درست ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں کل شام کو اپنی خالہ سے ملنے ''بھورے کی'' چلا گیا تھا اور وہاں سے میری واپسی کوئی گھنٹا بھر پہلے ہی ہوئی ہے۔''

''بھورے کی'' نامی وہ چھوٹا سا گاؤں موضع نوری آباد سے لگ بھگ چھ میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع تھا جہاں نوید کے مطابق اس کی خالہ اور خالو رہتے تھے۔ میں نے نوید کی ذات کو شک سے باہر لانے کی غرض سے پوچھ لیا۔

''تم کل شام کتنے بجے یہاں سے روانہ ہوئے تھے؟''

''وہ عصر کے بعد کا وقت تھا۔'' اس نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ''ابھی دن کا اجالا باقی تھا کہ میں ایک گھوڑے پر سوار ہو کر بھورے کی کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب میں خالہ کے گھر پہنچا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔''

''تم اکیلے ہی بھورے کی گئے تھے یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟''

''میں اکیلا ہی گیا تھا جناب۔ ویسے آپ.....!'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میری بات کی تصدیق کے لیے میرے گھر والوں سے پوچھ سکتے ہیں۔''

''اگر تصدیق کی ضرورت محسوس ہوئی تو ضرور پوچھوں گا، ویسے مجھے تمہاری بات پر بھروسا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''تمہارے خیال میں، ارشد کے قتل میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے.....؟''

''جناب! میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔''میرا تو خود دماغ چکرا کر رہ گیا ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ارشد کے ساتھ اس قسم کا واقعہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ ابھی کل ہی تو میں اسے ٹھیک ٹھاک ادھر چھوڑ کر گیا تھا.....!''

''ارشد سے تمہاری آخری ملاقات کب اور کس وقت ہوئی تھی؟''

''کل دوپہر کے بعد ہی تو ہم ملے تھے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔''ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر میں اپنے گھر چلا گیا اور وہ اپنی حویلی کی جانب۔ اس کے بعد یہاں کیا ہوتا رہا اس کی مجھے کوئی خبر نہیں۔''

''تمہارے جانے کے بعد یہاں جو کچھ ہوتا رہا اس کی خبر یہ ہے کہ پچھلی رات.....آدھی رات کے بعد کسی ظالم نے تمہارے دوست چودھری ارشد کے سینے میں خنجر گھونپ کر موت کی نیند سلا دیا ہے۔ یہ اندوہناک واقعہ کھیتوں کے اس حصے میں پیش آیا جہاں کٹی ہوئی فصل کے انبار لگے ہوئے ہیں اور میری اپنی تحقیق کے مطابق.....'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جب تمہارے دوست کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تو اس کے ساتھ کوئی لڑکی یا عورت بھی جائے وقوعہ پر موجود تھی.....!''

''یہ.....یہ آپ.....کیا کہہ رہے ہیں.....جناب؟'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں ملک نوید!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''مجھے جائے وقوعہ سے چند ایسے شواہد ملے ہیں جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ ارشد کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی۔''

''کیسے شواہد.....؟'' اس کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

میں نے دو چوڑیوں کے سات عدد ٹکڑے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے اور گہری سنجیدگی سے کہا۔''یہ ایک ایسی شے ہے کہ کسی لڑکی یا عورت کی کلائی ہی میں ہو سکتی ہے۔ دو چوڑیوں کے یہ سات ٹکڑے مجھے جائے وقوعہ پر پڑے ملے ہیں.....''

''مجھے یقین نہیں آ رہا جناب.....!'' وہ تعجب خیز لہجے میں بولا۔''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ

دن میں کسی لڑکی یا عورت کا ادھر سے گزر ہوا اور یہ چوڑیوں والے ٹکڑے اسی کے ہوں!''

''اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سلسلے میں، میں نے چودھری راشد سے مکمل پوچھ گچھ کر لی ہے۔ اس فصل کی کٹائی کے دوران میں کوئی لڑکی یا عورت کھیتوں میں نہیں گئی۔ اب تم مجھے بتاؤ گے کہ.....'' میں نے ایک مرتبہ پھر تھوڑا توقف کیا، اس کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ایسی لڑکی اور عورت کون ہو سکتی ہے جو چودھری ارشد کے اتنی قریب ہو کہ آدھی رات کو اس کے ساتھ ادھر کھیتوں میں پہنچ جائے؟''

''ملک صاحب! میں آپ کی بات کو جھٹلا تو نہیں رہا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جائے وقوعہ سے چوڑیوں کے ٹکڑے ملنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہاں کوئی لڑکی یا عورت گئی بھی ہو.....!'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''پھر تمہارے ذہن میں.....اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا نوید کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ گہرا اور سمجھدار نظر آتا تھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے اور مستحکم لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ قاتل نے کیس کا رخ کسی اور جانب موڑنے کے لیے، جائے وقوعہ پر چوڑیوں کے یہ ٹکڑے پھینک دیے ہوں.....!''

''ہاں، اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے اسی لیے میں نے تمہیں یہ کہا تھا کہ.....اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں اور.....اگر تم اس امر کی نشاندہی نہ کرتے تو میں خود ہی اس طرف آنے والا تھا۔ بہرحال.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''بہرحال، اگر قاتل پولیس کو گمراہ کرنے کے لیے اس قسم کا کوئی تاثر دینا بھی چاہتا تھا تو یہ اس امر کی جانب اشارہ ہے کہ کوئی نہ کوئی لڑکی چودھری ارشد کے قریب یا وہ خود کسی نہ کسی لڑکی کے قریب ضرور تھا.....اور یہ بات تم سے زیادہ بہتر اور کوئی نہیں جان سکتا۔''

''ہماری دوستی اور تعلق کو کئی سال ہو گئے ہیں ملک صاحب!'' اس نے گمبھیر لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''میں جانتا ہوں، چودھری ارشد کے کسی لڑکی یا عورت سے اس قسم کی وابستگی نہیں رہی کہ آدھی رات کے وقت وہ کھیتوں میں اس سے ملنے جاتا ہو۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ مجھے ضرور بتاتا لیکن.....!''

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا جیسے کسی خاص معاملے نے اس کی زبان کو بریک لگا دیے ہوں۔ اس موقع پر میں بھلا کیسے چوک سکتا تھا۔ اس کے رکتے ہی میں نے اضطراری لہجے میں پوچھ لیا۔

''لیکن کیا نوید.....؟''

وہ ایک لمحے کے تذبذب کے بعد گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ارشد اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا اس لیے میرے خیال میں، اس کے کسی معاملے کو آپ سے چھپانا ٹھیک نہیں ہوگا.....!''

''تمہارا یہ فیصلہ عقل مندی سے بھرا ہوا ہے۔'' میں نے ستائشی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے چودھری راشد کی زبانی مجھے ان دونوں بھائیوں کے بہت سارے معاملات کی خبر ہو چکی ہے۔ چودھری ناظم اور چودھری کاظم کی ملی بھگت سے ان دنوں یہاں جو کھیل کھیلا جا رہا ہے، کہیں تمہارا اشارہ اسی معاملے کی طرف تو نہیں؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، پہلو بدلتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''یہ اچھا ہوا کہ آپ یہ سب جان چکے ہیں۔ اب مجھے اپنی بات کہنے میں آسانی رہے گی۔ میرا اشارہ اسی معاملے کے ایک خاص پہلو کی طرف ہے۔''

''کون سا پہلو.....!'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''اس امر کی وضاحت بھی تو ہونا چاہیے نا؟''

''ضرور.....ضرور.....'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''چودھری ناظم اور ان کے چھوٹے بھائی چودھری کاظم کی ''ترکیب'' اگر آپ کے علم میں آ چکی ہے تو اس کہانی میں کہیں نزہت نامی کسی لڑکی کا ذکر بھی ہوا ہوگا.....!''

اتنا کہہ کر وہ سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھنے لگا۔ اس کی نظر میں کوئی ایسی بات تھی کہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی بہت بڑا انکشاف ہونے والا ہو، میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے

میں کہا۔

''ہاں، نزہت کا ذکر ہوا ہے۔ یہ لڑکی چودھری کاظم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ چودھری ارشد کو اس لڑکی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لہٰذا چودھری راشد کی کامیابی اور کارکردگی سے مطمئن ہونے کے بعد چودھری کاظم نزہت کی شادی راشد سے کر دیتا..... ہیں نا؟''

ملک نوید کے چہرے پر الجھن زدہ لکیروں کا ایک جال سا پھیل گیا۔ میری بات مکمل ہونے کے دوران میں وہ خاصا بے چین نظر آیا تھا۔ میں خاموش ہوا تو وہ بے یقینی سے بولا۔

''کیا یہ ساری باتیں آپ کو چودھری راشد نے بتائی ہیں؟''

''ہاں.....!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''کیا اس کہانی میں کوئی گڑبڑ ہے؟''

''آپ گڑبڑ کی بات کرتے ہیں جناب۔'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ''یہ تو بالکل الٹی کہانی ہے۔ چودھری ارشد نے مجھے جو کچھ بتایا تھا، وہ اس سے بہت مختلف ہے..... اب یہی ہو سکتا ہے کہ چودھری راشد حقیقت سے واقف نہ ہو..... وہ ایسا ہی سمجھ رہا ہو جیسا اس نے آپ کو بتایا ہے.....''

''میں بھی تو یہی جاننا چاہتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔'' میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''ملک نوید! تم مجھے پوری دیانت داری سے بتاؤ گے کہ اصل قصہ کیا ہے۔ چودھری ارشد نے تمہیں کون سی کہانی سنا رکھی ہے۔ اگر تم مقتول کے سچے دوست ہو تو تمہیں مجھ سے بھرپور تعاون کرنا چاہیے۔ چودھری ارشد کی دوستی اسی بات کا تقاضا کرتی ہے!''

''میں آپ سے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں ملک صاحب!'' وہ صدقِ دل سے بولا۔ ''آپ پوچھیں، مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں.....!''

''میں اس معاملے کی حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہوں نوید تاکہ چودھری ارشد کے قاتل کو جلد از جلد گرفتار کر سکوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے سب سے پہلے تو تم مجھے وہ بتاؤ جو مقتول نے تمہیں بتا رکھا ہے اور..... وہ چودھری راشد کی سنائی ہوئی کہانی سے تمہیں خاصا مختلف نظر آتا ہے.....؟''

ملک نوید نے ایک گہری سانس خارج کی پھر معتدل لہجے میں بتانے لگا۔ ''ملک صاحب! پچھلے چند دنوں سے یہاں نوری آباد میں جو کھیل کھیلا جا رہا ہے..... بلکہ کھیلا جا رہا تھا اس

سے تو آپ واقف ہو ہی چکے ہیں۔ کس طرح چودھری ناظم اور چودھری کاظم نے باہمی پروگرام سے دونوں بھائیوں کو راہِ راست پر لانے کی ترکیب کی وہ آپ کے سامنے ہے۔ چودھری ارشد نے بظاہر زمینداری کے کام میں دلچسپی ظاہر نہیں کی اور راشد کے سامنے وہ نزہت سے بھی دست بردار ہو گیا لیکن اس کے دل میں جو کچھ تھا وہ بالکل مختلف ہے.....''

''اس کا مطلب ہے، چودھری ارشد تم سے دل کی ساری باتیں کیا کرتا تھا۔'' وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''اب یہ بھی بتا دو کہ وہ خطرناک حقیقت کیا ہے جو چودھری نے اپنی کم علمی کی بنا پر یا پھر دانستہ مجھ سے چھپائی ہے؟''

''جی، میں آپ کو وہی بتانے والا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بڑی رسان سے بولا۔ ''یہ سچ ہے کہ چودھری ارشد کو کھیتی باڑی سے واقعی کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ پچھلے کئی دنوں سے نزہت میں بڑی ٹھیک ٹھاک دلچسپی لے رہا تھا اور اس معاملے کا وہ اکثر مجھ سے ذکر کرتا رہتا تھا۔ دراصل، اس دلچسپی کا ایک سبب تھا.....!''

وہ لمحے بھر کے لیے سانس لینے کو تھما تو میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا بلکہ بڑی توجہ سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ وہ لمحاتی توقف کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''وہ سبب خود نزہت تھی۔ ویسے تو راشد اور ارشد دونوں ہی گاہے بہ گاہے اپنے چاچا جی سے ملنے جلال پور کے چکر لگاتے رہتے تھے لیکن دونوں کے ذہنوں میں پلنے والا مشن جدا جدا تھا۔ راشد اپنے چاچا جی کی ہدایت پر جان توڑ عمل کر رہا تھا اور اس کا خیال یہ تھا کہ اگر چودھری کاظم اس سے خوش ہو گیا تو اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ چودھری ناظم اسے نوری آباد کی چودھراہٹ سونپ دے گا اور چودھری کاظم اپنی بیٹی کو اس سے بیاہ دے گا۔ وہ انہی خیالات کی دھن میں پورا پورا دن کھیتوں میں موجود رہ کر فصل کی کٹائی اپنی نگرانی میں کروا رہا تھا جبکہ چودھری ارشد کی منصوبہ بندی قدرے مختلف تھی.....!'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''چودھری ارشد نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے بڑے بھائی کو یہی تاثر دیا ہے کہ نزہت سے اسے کوئی مطلب نہیں لیکن درحقیقت اس کی ساری توجہ نزہت ہی پر لگی ہوئی ہے کیونکہ وہ اسے

پسند کرتی ہے۔ راشد کی قدر و قیمت چودھری کاظم کی نظر میں ضرور ہو گی لیکن نزہت اسے ایک بھائی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے بڑے واضح اور دھمکی آمیز الفاظ میں چودھری ارشد کو بتایا تھا کہ وہ صرف اور صرف اسی کو چاہتی ہے اور اگر کسی مرحلے پر چودھری کاظم نے زبردستی اس کی شادی چودھری راشد سے کرنے کی کوشش کی تو وہ زہر کھا کر اپنی جان دے دے گی لیکن راشد سے شادی نہیں کرے گی۔ ارشد چونکہ خود بھی اسے پسند کرتا تھا لہٰذا اس نے نزہت کو تسلی دلاسا دینے کے بعد یہ یقین بھی دلا دیا کہ وہ صرف اور صرف اسی کی ہے اور اسی کی رہے گی۔ نزہت کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے ابا جی، بڑے بھائی اور دنیا کی ہر رکاوٹ سے ٹکرا جائے گا۔ چودھری راشد یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنے ابا جی اور چاچا جی کو خوش کر کے میدان مار لے گا۔ ایک طرف اسے موضع نوری آباد کی چودھراہٹ ملے گی اور دوسری جانب وہ حسین و جمیل نزہت پر بھی قابض ہو جائے گا لیکن چودھری ارشد اپنے بڑے بھائی کو اندھیرے میں رکھتے ہوئے کوئی اور ہی پروگرام بنائے بیٹھا تھا۔ ویسے ایک بات کا مجھے پورا یقین ہے کہ ارشد کو زمین و جائداد سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد نزہت کا حصول تھا اور دوسری جانب نزہت نہ صرف یہ کہ بڑے بھرپور انداز میں اس کا ساتھ دے رہی تھی بلکہ اس نے اپنے کام کو پکا کرنے کے لیے اور اپنے مقصد میں مکمل کامیابی حاصل کرنے کے لیے ایک شاطرانہ چال بھی چل دی تھی.....!''

ملک نوید سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

''یہ تو تم ایک بالکل مختلف اور سنسنی خیز کہانی سنا رہے ہو.....؟''

''یہی سچ ہے ملک صاحب!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم نے ابھی نزہت کی کسی شاطرانہ چال کا ذکر کیا ہے۔ وہ کیا چکر تھا؟''

وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''نزہت نے اپنے اور ارشد کے معاملے کے بارے میں اپنی ماں آسیہ بی بی کو سب کچھ بتا دیا تھا اور ساتھ ہی حتمی انداز میں اپنا فیصلہ بھی سنا دیا تھا۔ آسیہ نے نزہت کی دیوانگی اور سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے تنہائی میں چودھری ارشد سے ملاقات بھی کی تھی۔ جب آسیہ کو پتا چلا کہ دونوں طرف برابر کی آگ لگی ہوئی ہے تو اس نے مصلحت کوشی کو کام میں لاتے ہوئے دونوں سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ان کے ملاپ کے لیے بھرپور کوشش کرے گی۔ ساتھ ہی ان

سے یہ عہد بھی لے لیا تھا کہ وہ لوگ اپنی مرضی سے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جو سنگین ہونے کے ساتھ ساتھ خاندان کے لیے شرمندگی کا باعث ہو لیکن اس کے باوجود میں.....'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! اس تمام تر صورت حال کے باوجود میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ گزشتہ رات نزہت، ارشد کے ساتھ ادھر کھیتوں میں موجود تھی۔ پتا نہیں کیوں..... مجھے اندر سے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے جائے وقوعہ پر محض اس لیے ڈالے گئے ہیں تا کہ پولیس کی تفتیش کو غلط رخ پر ڈالا جا سکے۔ یہ قاتل کی کوئی گہری چال بھی ہو سکتی ہے!''

''بالکل، یہ قاتل کی کوئی سازشی چال ہو سکتی ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے مکمل اتفاق کرتا ہوں لیکن میرے لیے یہ جاننا سب سے زیادہ اہم ہے کہ ایسی چال کون چل سکتا ہے۔ کیا اس سلسلے میں تم میری کوئی مدد کر سکتے ہو.....؟''

وہ چند لمحات تک گہرے تذبذب اور سوچ کی ملی جلی کیفیت میں مبتلا رہا پھر نفی میں گردن ہلاتی ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب، میں اس بارے میں کسی پر شک ظاہر نہیں کر سکتا۔''

''چودھری راشد کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے، چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

میں نے اپنے ذہن میں موجود ایک امکانی اندیشے کو زبان پر لایا تھا۔ ملک نوید نے پوری توجہ سے میرا سوال سنا پھر نفی میں گردن ہلا دی۔ ''میرا دھیان چودھری راشد کی طرف نہیں جا سکتا ملک صاحب اور اس کی ایک خاص وجہ ہے.....!''

وہ لمحے بھر کے لیے رکا تو میں نے ''خاص وجہ'' کی تفصیل جاننے کے لیے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ خود ہی اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''اول تو چودھری راشد کو اصل حالات کی خبر ہی نہیں ہے۔ ارشد، نزہت اور آسیہ کے بیچ جو کھچڑی پک رہی تھی اس کی خوشبو راشد کی ناک تک نہیں پہنچی تھی لہٰذا وہ ارشد سے کسی قسم کی دشمنی کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ اس کی ساری توجہ تو فصل کی کٹائی اور زمینداری پر لگی ہوئی ہے۔ دوم.....'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''دوم..... یہ کہ دونوں بھائیوں کے درمیان جو خاموش معاہدہ ہو چکا تھا اس میں سراسر چودھری راشد ہی کا فائدہ تھا۔ بڑے چودھری صاحب اس کی کارکردگی سے متاثر ہو کر اسے گاؤں کا آئندہ چودھری مقرر کر دیتے، چاچا جی اس کی کامیابی سے خوش ہو کر نزہت کی شادی اس سے کر دیتے۔ چودھری راشد کو تو پانچوں گھی میں نظر آ رہی تھیں۔ چودھری ارشد کی ذات کہیں بھی اور کسی بھی حوالے سے اس کی راہ میں رکاوٹ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ان حقائق کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ چودھری راشد کے پاس ایسا سنگین قدم اٹھانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔''

''ٹھیک ہے، مجھے تمہاری اس تجزیاتی وضاحت میں خاصا وزن محسوس ہوتا ہے لیکن ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناتے، میں شک کے کسی موہوم سے موہوم امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چودھری ارشد تم سے اپنے دل کی ساری باتیں کر لیا کرتا تھا۔ کیا کوئی اور بھی ایسا شخص تھا جس سے اس نے نزہت والے معاملے پر بات کی ہو؟''

''میرے خیال میں ایسا کوئی دوسرا شخص نہیں تھا.....!'' وہ پورے وثوق سے بولا۔

''کیا چودھری ناظم بھی نہیں؟''

''میرا خیال ہے، نہیں!''

''ہوں.....!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

ہمارے درمیان چند لمحات کے لیے خاموشی چھائی رہی پھر ملک نوید نے کہا۔ ''میری معلومات کے مطابق، ابھی تک اس نے اپنے ابا جی سے نزہت والے معاملے پر بات نہیں کی تھی لیکن میں نے اسے یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ کوئی مناسب سا موقع دیکھ کر چودھری ناظم کے کان میں یہ بات ضرور ڈال دے تاکہ آگے چل کر کوئی بڑی بدمزگی نہ ہو۔ ارشد نے میرے مشورے سے اتفاق تو کیا تھا لیکن میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اس مشورے پر عمل بھی کیا تھا یا نہیں!''

''تمہارے اس تعاون کا بہت بہت شکریہ ملک نوید!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے امید ہے، تم نے اس سلسلے میں کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا ہوگا۔ آئندہ بھی اگر مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پیش آئے گی تو تم اسی طرح تعاون کرو گے!''

''حاضر جناب.....!'' وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرماں برداری سے بولا۔

''اور تم اس ملاقات کا ذکر بھی کسی سے نہیں کرو گے، چودھری راشد سے بھی نہیں!'' میں

نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''جو بھی پوچھے، بس یہی بتانا کہ تھانیدار صاحب نے معمول کی پوچھ گچھ کے لیے بلایا تھا..... میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میری زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکلے گی جو آپ کے لیے کوئی الجھن یا مشکل پیدا کر دے۔ میں موجودہ حالات کی نزاکت اور سنگینی کو اچھی طرح محسوس کر رہا ہوں۔''

''شاباش..... مجھے تم سے یہی امید تھی..... اور ہے!''

چند لمحات کے بعد میں نے ملک نوید کو رخصت کر دیا۔

✠ ✠ ✠

اسی رات میں ایک مرتبہ پھر چودھری ناظم کی حویلی میں موجود تھا۔ چودھری ناظم کو ہوش آ چکا تھا لیکن اس کی ذہنی حالت ٹھکانے پر نہیں تھی۔ میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھ تاچھ کی کوشش کی تو جلد ہی مجھے یہ محسوس ہو گیا کہ اس کی ذہنی کیفیت ابھی اس کام کے لیے موزوں نہیں۔ میں چودھری ناظم کو کل پر موقوف کر کے دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تعزیت کے لیے وہاں آنے والوں میں چودھری کاظم پیش پیش تھا۔

میں نے چودھری راشد سے معلومات حاصل کر کے پلک جھپکتے میں یہ جان لیا کہ جلال پور سے چودھری کاظم، اس کی بیوی آسیہ اور بڑا بیٹا حق نواز آئے ہوئے تھے۔ حق نواز سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں تھی البتہ، چودھری راشد کے بیان کی تصدیق کے لیے چودھری کاظم سے اور ملک نوید کے انکشافات کی روشنی میں چودھرائن آسیہ بی بی سے ملاقات ضروری تھی لہٰذا اس کام کے لیے میں نے چودھری راشد کو سہارا بنایا اور ان میاں بیوی کے پاس پہنچ گیا۔

چودھری کاظم کی عمر پچپن سال کے قریب تھی۔ وہ ایک پُر وقار شخصیت کا مالک دبنگ انسان تھا۔ اس نے قیمتی شلوار قمیص پر سیاہ واسکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ روایتی چودھریوں کے بجائے آج کل کا کوئی ایم این اے یا ایم پی اے نظر آتا تھا۔

چودھری کاظم سے ہونے والی بات چیت، سے چودھری راشد کے بیان کی تصدیق ہو

گئی۔اس نے بڑی تفصیل سے مجھے بتایا کہ ان دونوں بھائیوں نے کس طرح حکمتِ عملی تیار کر کے راشد اور رارشد کو محنت کی طرف لانے کی کوشش کی تھی۔آخر میں وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''افسوس.....کہ جب یہ منصوبہ اپنی تکمیل کے آخری مرحلے میں تھا تو یہ حادثہ پیش آ گیا!''

''چودھری صاحب! آپ ماشا اللہ! جہاں دیدہ اور تجربہ کار انسان ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''آپ کے خیال میں، چودھری ارشد کے قتل میں کس کا ہاتھ ہوسکتا ہے؟''

''جناب! میں یہ اندازہ کس طرح لگا سکتا ہوں۔'' وہ لاتعلقی کے سے انداز میں بولا۔

''قاتل جو کوئی بھی ہے، وہ یقیناً ارشد کا دشمن ہی ہوگا اور.....اس قاتل تک پہنچنا آپ کا کام ہے تھانیدار صاحب.....!''

چودھری کاظم کا آخری جملہ مجھے ناگوار تو گزرا لیکن میں نے چہرے سے اپنے دلی جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔میں پوری ہمدردی اور شدومد سے قاتل کی تلاش میں تھا۔چودھری کاظم کو اس لہجے میں مجھ سے بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔تاہم میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''چودھری صاحب! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ان شاءَ اللہ! بہت جلد قاتل کی گردن میرے ہاتھ میں ہوگی۔میں نے آپ سے وہ سوال محض اس لیے کیا تھا کہ شاید آپ کسی جانب اشارہ کرسکیں خیر.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خاج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ دونوں بھائیوں نے بچوں میں سدھار پیدا کرنے کی لیے جو اسکیم آزمائی تھی اس کے اب تک کے نتائج سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ آزمائشی مقابلہ چودھری راشد ہی جیت سکتا تھا۔چودھری ارشد نے خود کو منوانے کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی؟''

''آپ خاص اور عام کوشش کی بات کرتے ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔''اس نالائق نے تو سرے سے کوئی کوشش ہی نہیں کی لیکن.....'' وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہوا پھر دل گرفتہ آواز میں بولا۔

''ارشد کی نالائقی اور نکما پن ایک طرف لیکن مجھے اس کی المناک موت کا بڑا دکھ ہے۔

اس کی موت کا سن کر تو مجھے رب نواز کے قتل کا خیال آ گیا ہے۔ تین سال پہلے، وہ بھی بھری جوانی میں قتل ہو گیا تھا۔ پتا نہیں، کس منحوس کلموہے کی نظر لگ گئی ہے ہمارے خاندان کو۔''

''وہ کلموہا بہت جلد میری گرفت میں ہو گا چودھری صاحب!'' میں نے بڑے مضبوط اور تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ سے بس آخری سوال ہے اور یہ سوال خاصا ذاتی نوعیت کا ہے۔ اگر آپ کوئی کوئی اعتراض نہ ہو تو جواب بھی دے دیں۔''

''آپ پوچھیں جی..... کیا پوچھنا ہے!''

میں نے پوچھا۔ ''اگر چودھری راشد..... جیسا کہ بڑے واضح انداز میں نظر آ رہا تھا، اس آزمائشی مقابلے میں جیت جاتا تو آپ اپنی بیٹی نزہت کی شادی اس سے کر دیتے؟''

''اس میں تو کسی شک و شبہے کی گنجائش ہی نہیں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''یہ آزمائشی مقابلہ تو ایک اتفاق سے سامنے آ گیا تھا۔ اگر مجھے اپنی بیٹی نزہت کے لیے راشد اور ارشد میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا پڑتا تو میں راشد ہی کا انتخاب کرتا۔ وہ ہر لحاظ سے نزہت کے لیے موزوں ہے۔''

''اور اس سلسلے میں آپ.....'' میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ''اپنی بیٹی نزہت اور دیگر افراد خانہ سے کوئی صلاح مشورہ بھی کرتے یا نہیں؟''

''تھانیدار صاحب! میں اپنی حویلی کے اندر تمام تر فیصلے خود ہی کرتا ہوں اور ان فیصلوں پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔''

میں نے آسیہ بی بی کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا تو وہاں مجھے اچھی خاصی بے چینی اور اضطراب نظر آیا۔ صاف لگتا تھا کہ اپنے شوہر کا یہ حاکمانہ انداز اسے پسند نہیں آیا تھا لیکن ظاہر ہے، وہ معاشرتی روایت کے تحت مجبور تھی، چودھری کاظم کو کوئی منہ توڑ جواب نہیں دے سکتی تھی۔ ان لمحات میں، میرے دل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اگر مجھے تنہائی میں آسیہ سے دو باتیں کرنے کا موقع مل جائے تو بہت سے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھ جائے گا۔

پتا نہیں، وہ قبولیت کی گھڑی تھی یا یہ ایک اتفاق تھا کہ اسی لمحے دروازے پر چودھری راشد نمودار ہوا اور آتے ہی چودھری کاظم سے بولا۔

''چاچا جی! آپ کو ابا جی یاد کر رہے ہیں.....!''

چودھری کاظم ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! میں بھائی جی کی بات سن کر ابھی آتا ہوں۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ چودھری کاظم اپنے بھتیجے کے ہمراہ میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا تو میں نے رُوئے سخن آسیہ کی طرف موڑتے ہوئے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''چودھرائن جی..... آپ کا گھر والا بڑا ظالم شخص ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب.....؟'' وہ چونکتی نظر سے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

اگرچہ اس کے انداز اور الفاظ میں بڑی احتیاط پائی جاتی تھی لیکن میں یہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا کہ میرا تبصرہ اس کو بہت پسند آیا تھا۔ میں نے بدستور اسی لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جس شخص کو اپنی اولاد کی خوشیوں کی پروا نہ ہو اور..... وہ اپنی انا کی تسکین کی خاطر بیوی بچوں پر اپنے فیصلے مسلط کرتا ہو..... اسے ظالم نہیں تو اور کیا کہا جائے گا.....؟''

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اگر چودھری صاحب نے سن لیا تو.....''

''تو قیامت آ جائے گی..... ہیں نا؟'' میں نے اس کا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔'' وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''لیکن آپ کی ان باتوں سے میری ضرور شامت آ جائے گی۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے ایک مرتبہ پھر دروازے کی طرف دیکھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں آسیہ بی بی۔ میں حقیقت سے واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ نزہت اور ارشد ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور یہ بات تمہیں بھی پتا ہے لیکن چودھری کاظم ارشد کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا اور وہ نزہت کی شادی راشد سے کرنے کا خواہش مند تھا لیکن ارشد کے قتل کے بعد تو کاظم کی من مانی کے لیے راہ ہموار ہو گئی ہے۔ اس صورت میں نزہت کیا کرے گی؟''

وہ چند لمحات تک یک ٹک مجھے دیکھتی رہی پھر جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آپ کو..... یہ ساری باتیں..... کس نے..... بتائی ہیں.....؟''

''ارشد کے ایک بہت ہی راز دار دوست نے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے

ہوئی گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اس معاملے کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ نزہت اور ارشد کی باہمی پسندیدگی اور محبت کا علم چودھری کاظم کو بھی تھا یا نہیں؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور جواب دیا۔ ''ابھی چند روز پہلے ہی یہ معاملہ چودھری صاحب کے علم میں آیا ہے اور جب ہی سے ہماری حویلی میں ایک طوفان اٹھا ہوا تھا۔ سب سے زیادہ کم بختی نزہت کی آئی ہوئی ہے۔ وہ ایک ہی بات پر ڈٹی ہوئی تھی کہ کسی بھی قیمت پر راشد سے شادی نہیں کرے گی اور اب تو.....'' وہ ڈرے سہمے انداز میں متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''اب تو ارشد باقی ہی نہیں رہا۔ پتا نہیں، کیا قیامت آئے گی۔ چودھری صاحب غصے کے بہت تیز ہیں۔ اگر نزہت اپنی ضد پر اڑی رہی تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ خیر کرے.....!''

''اللہ خیر ہی کرے گا چودھرائن جی۔'' میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ''بس، ایک آخری بات بھی بتا دیں کہ چودھری کاظم کو ارشد اور نزہت والے معاملے کی خبر کیسے ہوئی۔ یہ بات تو نزہت، ارشد اور آپ کے درمیان تھی؟''

''یہ بات چودھری صاحب کو ان کے بھائی جی نے بتائی ہے۔'' وہ ناگواری سے بولی۔ ''چار پانچ دن پہلے چودھری صاحب نوری آباد آئے تھے۔ یہاں سے جانے کے بعد ہی ان کا دماغ خراب ہوا ہے۔ یہ ساری آگ چودھری ناظم نے لگائی ہے جناب لیکن.....آپ سے میری ایک درخواست ہے جی۔''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہو کر امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔ ''چودھری صاحب (چودھری کاظم) کو کسی طرح یہ پتا نہ چلے کہ میں نے آپ سے گھریلو معاملے کی کوئی بات کی ہے.....!''

''آپ نے مجھ سے کسی سلسلے میں کوئی بات نہیں کی چودھرائن جی لہٰذا آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ہاں، اگر آپ کو پتا ہے تو بتا دیں کہ چودھری ناظم تک یہ قصہ کس نے پہنچایا تھا؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

اسی لمحے باہر چودھری کاظم اور چودھری راشد کی باتیں کرنے کی آواز ابھری اور میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تاثر یہی دیا کہ چودھری کے غیاب میں میری اس کی بیوی سے کسی قسم کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ چودھری کاظم کے حوالے سے میرے ذہن میں اس کی ایک تصویر سی بن گئی تھی۔ اس کے آتے ہی میں اسی کی جانب متوجہ ہو گیا اور ذہن میں موجود اس کی تصویر میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''چودھری صاحب! آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کے خاندان کو کسی بدخواہ کی نظر لگ گئی ہے۔'' میں نے تھوڑا توقف کر کے چودھری کاظم کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں مجھے خاصی سنجیدگی اور تشویش نظر آئی۔ میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جب انسان کے پاس زمین کی طاقت اور اختیار ہو تو دوستوں کے ساتھ دشمن بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ آپ کو کیا لگتا ہے، ارشد کا قتل کسی دشمنی ہی کا نتیجہ تو نہیں.....؟''

''یہ بات میں رب نواز کے لیے تو کھلم کھلا کہہ سکتا ہوں ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''رب نواز کا قتل میرے دیرینہ دشمنوں کا کیا ہوا ایک وار ہی تھا لیکن بھائی جی میری طرح دشمنوں میں گھرے نہیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا، ارشد کو کس نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔''

''چودھری ناظم دشمن دار شخص نہیں لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے، ارشد کی کسی سے ذاتی رنجش ہو۔'' میں نے بدستور چودھری کاظم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور اس بدبخت نے موقع نکال کر ارشد کو ٹھکانے لگا دیا ہو۔''

''یہ ہو سکتا ہے.....'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اب یہ آپ کا کام ہے کہ ارشد کے قاتل کو جلد از جلد گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیں۔''

''ان شاء اللہ! ایسا ہی ہو گا۔'' میں نے پُر وثوق انداز میں کہا۔ ''آپ بہت جلد ارشد کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچتے ہوئے دیکھیں گے لیکن اس کام کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی اشد ضرورت ہے۔''

''میرے تعاون کی ضرورت ہے۔'' اس نے عجیب سی الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''آپ ایک دشمن دار شخص ہیں چودھری صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں

کہا۔ ''اپنے دشمنوں کی خبر رکھنے اور ان سے نمٹنے کے لیے آپ نے چند وفادار نمک خوار بھی پال رکھے ہوں گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا.....؟''

میں ایک خاص زاویے سے چودھری کاظم میں گھس رہا تھا اور میرے اندر سے یہ آواز اٹھ رہی تھی کہ یہ خاص زاویہ یقیناً رنگ لائے گا۔ چودھرائن آسیہ سے ہونے والی گفتگو کے نتیجے میں چودھری کاظم بھی مشکوک افراد کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا۔ میرے استفسار کے جواب میں اس نے جلدی سے کہا۔

''آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں ملک صاحب! ہر انسان کو اپنی حفاظت کا حق حاصل ہے، میں نے بھی دو تین بندوں کو اس کام کے لیے رکھا ہوا ہے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ اس بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں.....؟''

''دراصل، میں ارشد کے قاتل تک پہنچنے کے لیے آپ کے خاص آدمیوں سے مدد حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''میں نے چودھری راشد کے علاوہ دیگر لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کی ہے مگر ابھی تک ایک بھی ایسا آدمی سامنے نہیں آیا جس پر قاتل ہونے کا شبہ کیا جا سکے۔'' میں تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی پھر ایک مخصوص سوچ کے تحت اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اگر چند دنوں کے لیے آپ مجھے اپنے وہ دو تین خاص بندے دے دیں تو میں ان سے کام لے کر قاتل تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جائے وقوعہ سے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے جو ٹکڑے ملے ہیں وہ کہانی بھی آپ کے علم میں آ چکی ہے۔ میں اپنے مشن میں چند ایسے افراد کو بھی شامل کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق نوری آباد سے نہ ہو اور اس کام کے لیے آپ کے وفادار سب سے زیادہ موزوں ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپ نے چودھری ناظم کی ذہنی حالت تو دیکھ ہی لی ہے.....!'' اپنی گفتگو کے اختتام پر میں نے جذبات کی مار مارتے ہوئے کہا۔

''چودھری صاحب کو اس تفتیشی معاملے میں گھسیٹنا تو زیادتی والی بات ہوگی۔ ان کی ذہنی اور جسمانی صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ اب اس صورتِ حال میں آپ ہی نے ایک اہم کردار ادا کرنا ہے۔ اگر آپ کا تعاون مجھے حاصل رہا تو میں ان شاءَ اللہ! بہت جلد آپ کو ایک بڑی خوش خبری سناؤں گا۔ ارشد کے قاتل کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دیکھنے کی آپ کی تمنا ضرور پوری ہو

گی۔''

وہ میری فرمائش سے کھلم کھلا انکار تو نہ کر سکا لیکن میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ کسی اندرونی الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ اسے میری بات پسند نہیں آئی۔ وہ اپنے خاص آدمیوں کو میرے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ چودھری کاظم کا یہی احتراز میرے شک کو مہمیز کرتا تھا۔ لمحاتی سوچ بچار کے بعد اس نے بددلی سے کہہ دیا۔

''ٹھیک ہے جناب! میں اپنے بندوں کو یہاں بلا لیتا ہوں۔ آپ جس طرح چاہیں، ان سے کام لیں۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی کہ ارشد کے قاتل کو عبرت ناک سزا دلوانے کے لیے میں اور میرے بندے کوئی مفید کردار ادا کر سکیں.....''

دس پندرہ منٹ کی مزید بات چیت کے بعد میں واپس آ گیا۔

✠ ✠ ✠

آئندہ روز اسپتال سے چودھری ارشد کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش، رپوٹ کے ساتھ آ گئی۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق، وقوعہ کی رات مقتول ارشد کی موت بارہ سے چار بجے کے درمیان ہی واقع ہوئی تھی۔ وجہ موت وہی خطرناک خنجر تھا جو دستے تک اس کے سینے میں گھونپ دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں فنگر پرنٹس وغیرہ لینے کا رواج نہیں تھا اور نہ ہی عدالت ان کو کوئی اہمیت دیتی تھی ورنہ قتل کی بہت ساری وارداتیں، آلہ قتل کی بازیابی کے ساتھ ہی حل کی جا سکتی تھیں۔ آج کل، ہمارے زمانے کی بہ نسبت تفتیش اور تحقیق کی جدید ترین سہولیات میسر ہیں لیکن بڑے افسوس اور اپنے ڈیپارٹمنٹ سے معذرت کے ساتھ میں یہ ضرور کہوں گا کہ آج کے مقابلے میں، ہمارے زمانے میں جرائم کی بیخ کنی کا تناسب زیادہ تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے جہاں میرے اس اندازے کی تصدیق کی تھی کہ مقتول ارشد کی موت آدھی رات کے بعد کسی وقت واقع ہوئی تھی وہیں اس امر کی جانب بھی واضح اشارہ تھا کہ موت کے منہ میں جاتے ہوئے مقتول کا دل و دماغ اس کے قابو میں نہیں تھا۔ اس کے معدے کے ٹیسٹ سے پتا چلا تھا کہ موت سے تھوڑی دیر پہلے اسے کوئی ایسی شے کھلائی گئی تھی جس نے اس کی مدافعتی قوت کا سواستیاناس کر کے رکھ دیا تھا جب وہ اس واردات کے مقابلے میں وہ مزاحمت پیش

نہیں کر سکا تھا جو ایسے معاملات میں عموماً دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسی لیے ارشد کی لاش کو دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔

دوپہر کے بعد، ضروری کارروائی کر کے میں نے چودھری ارشد کی لاش اس کے بڑے بھائی چودھری راشد کے حوالے کر دی۔ میں بھی لاش کے ساتھ ہی حویلی آیا تھا اور اسی دوران میں مجھے چودھری ناظم سے بھی بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اسے ابھی تک ارشد کی لاش کی واپسی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔

مجھے چودھری ناظم کا کوئی لمبا چوڑا انٹرویو نہیں کرنا تھا۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ نزہت اور ارشد والا معاملہ اس کے علم میں کیسے آیا۔ مجھے اپنے مقصد میں کلی کامیابی حاصل ہوئی۔ چودھری کی زبانی پتا چلا کہ اس سلسلے میں ارشد نے خود اس سے بات کی تھی۔

''وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔'' چودھری ناظم نے نحیف سی آواز میں بتایا۔ ''کہہ رہا تھا، اسے زمین، جائداد اور چودھراہٹ کچھ بھی نہیں چاہیے۔ بس، وہ نزہت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ نزہت راشد کو ناپسند کرتی ہے اور اسے بے پناہ چاہتی ہے۔ اگر مجھے یقین نہ آ رہا ہو تو میں نزہت کی ماں سے پوچھ لوں.....''

بولتے بولتے اس کی سانس پھول گئی۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''ارشد کا دعویٰ تھا کہ اگر کاظم نے زبردستی نزہت کی شادی راشد سے کرنے کی کوشش کی تو نزہت زہر کھا کر مر جائے گی۔ اس نے بڑے ولولے سے اس عزم کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ نزہت کو حرام موت نہیں مرنے دے گا بلکہ ایسا موقع آنے سے پہلے ہی وہ نزہت کو اچک کر لے جائے گا، چاہے بعد میں اس کی اس حرکت کا انجام کچھ بھی ہو..... اس کے ساتھ ہی ارشد نے دھمکی بھرے انداز میں مجھ پر زور بھی دیا تھا.....'' وہ ایک مرتبہ پھر رک کر کھانسنے لگا، پھر چند گہری سانسیں لینے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''ارشد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کاظم کو یہاں بلا کر اس معاملے پر بات کروں اور اسے سمجھانے کی کوشش کروں کہ وہ بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں ارشد کے حق میں فیصلہ کرے۔ وہ نزہت کو حاصل کرنے کے لیے زمین، جائداد اور مال و دولت ہر شے کو ٹھکرانے کے لیے تیار ہے۔''

''پھر آپ نے چند روز پہلے کاظم کو یہاں بلا کر اس سنگین موضوع پر بات کی تھی؟'' چودھری ناظم کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

''ہاں.....!''اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

''پھر چودھری کاظم کا کیا ردِعمل تھا؟''

''کاظم نے پہلی مرتبہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تھی۔''چودھری ناظم نے زخمی لہجے میں بتایا۔''کہنے لگا.....بھائی جی، یہ نہیں ہوسکتا۔ میں نے کہا،تم گھر جاؤ اور اس مسئلے پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرو.....اور وہ خاموشی سے رخصت ہوگیا تھا۔''

''آپ نے اس معاملے کا اور کس کس سے ذکر کیا تھا؟''

''کسی سے نہیں!''اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

''چودھری راشد کو اس تازہ ترین صورتِ حال کی خبر تھی؟''میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

''نہیں، بالکل نہیں۔''وہ ایک مرتبہ پھر قطعیت سے بولا۔''راشد کو ابھی تک اس معاملے کا علم نہیں.....ہاں، اگر کاظم نے اس کے کان میں کچھ پھونک دیا ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا.....!''

میں نے اس تسلی کے بعد چودھری ناظم کو فارغ کر دیا۔''چودھری صاحب! میں آپ کے مقتول بیٹے کو تو واپس نہیں لاسکتا لیکن یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ چند روز میں، میں چودھری ارشد کے قاتل کو گرفتار کرلوں گا!''

اور پھر واقعی چند روز میں، میں نے یہ وعدہ پورا کر دکھایا۔

اس روز مغرب سے پہلے ارشد کی تدفین ہوگئی تھی اور اس سے اگلے روز چودھری کاظم نے شیدا، جیرا اور بھولا نامی اپنے تین خاص بندے میرے حوالے کر دیے کہ میں ان کی مدد اور تعاون سے چودھری ارشد کے قاتل تک پہنچنے کی کوشش کروں۔

چودھری کاظم کے مزاج، فطرت اور اس کی بیوی آسیہ سے ہونے والی گفتگو کے نتیجے میں، میرے ذہن میں ایک خاص سوچ نے جنم لے لیا تھا لہٰذا میں نے تفتیش کی آڑ میں رشید عرف شیدا، نذیر عرف جیرا اور اسلم عرف بھولا کو مختلف نفسیاتی ٹرائل سے گزارا۔ ان کے ذہن اور دل میں چونکہ چور چھپا بیٹھا تھا لہٰذا وہ چودھری کاظم کی ہدایت کے مطابق، حد سے زیادہ احتیاط کا مظاہرہ کرتے رہے اور اسی بے جا احتیاط کے دوران میں ان سے بھیانک غلطیاں ہونے لگیں جس سے میرا شک یقین میں بدل گیا۔ میری چھٹی حس نے جیسے ہی گرین سگنل دیا، میں نے شیدا، جیرا اور

بھولا کو اپنے تھانے کے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔

''یہ مہمان داری'' انہیں چوبیس گھنٹے سے زیادہ راس نہ آئی اور انہوں نے اپنی زبانوں کے قفل کھول دیے۔ چودھری کاظم کے حکم پر انہی ڈشکروں نے بہانے سے چودھری ارشد کو حویلی سے باہر نکالا تھا اور یہ راگ سنا کر کھیتوں میں لے آئے تھے کہ نزہت گھر چھوڑ آئی ہے اور وہاں کھیتوں میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔ چودھری ارشد اپنے قاتلوں کے ساتھ کشاں کشاں جائے وقوعہ پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا ہوگا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، اس معاملے کو سمجھنے کے لیے کسی خاص عقل کی بھی ضرورت نہیں۔

ان تینوں کے اقبالی بیان کے مطابق، شیدا اور بھولا نے چودھری ارشد کو قابو کیا تھا اور جیرا نے اس کے سینے میں خنجر اتارا تھا۔ انہیں بھی اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ موت کو گلے لگاتے ہوئے ارشد نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ نے جس امر کی نشاندہی کی تھی اس میں چودھری ارشد کا اپنا ہی ''ہاتھ'' ہوگا۔ ممکن ہے، اس نے اپنی دانست میں کوئی سکون بخش شے استعمال کی ہو اور اس سے پہلے کہ وہ سونے کے لیے لیٹتا، اسے نزہت کا چارا دکھا کر کھیتوں میں پہنچا دیا گیا تھا۔

میں نے ان تینوں کے اقرار جرم کے بعد پہلی فرصت میں چودھری کاظم کو گرفتار کر کے اپنے تھانے کی حوالات میں پہنچا دیا۔ اس واقعے کا سب سے بڑا مجرم وہی تھا کیونکہ اس کے نمک خواروں نے اسی کی فرمائش پر چودھری ارشد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

انسان غصے، خودسری اور اپنی انا کی تسکین کی خاطر بعض اوقات اتنا آگے نکل آتا ہے کہ تمام اصول ضابطے اور ضد و قیود بہت پیچھے رہ جاتی ہیں۔ چودھری کاظم نے بھی کچھ اسی قسم کے کردار کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے ایک مرتبہ بھی سوچ لیتا تو یہ سنگین قدم اٹھانے سے باز رہتا۔ وہ ارشد کو پسند نہیں کرتا تھا اور نزہت والا معاملہ سامنے آنے کے بعد تو اسے ارشد سے نفرت ہوگئی تھی اور اسی نفرت کی آگ میں جل کر اس نے ارشد کو صفحہ ہستی ہی سے مٹا ڈالا تھا۔

چودھری ناظم کے بیٹے کھرے سکے تھے یا کھوٹے سکے، اس کا فیصلہ قارئین اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق خود ہی کر لیں۔ میری رائے اس کہانی کے عنوان میں محفوظ ہے۔ میرے خیال میں، چودھری ناظم نے اپنی اولاد کو پرکھنے میں غلط کی تھی۔

اور..... غلطی تو کسی سے، کسی وقت بھی ہو سکتی ہے!

# منہ کالک

صدیوں سے پڑھتے، سنتے اور دیکھتے آئے ہیں کہ ولی کے گھر میں شیطان اور شیطان کے گھر میں ولی پیدا ہوسکتا ہے۔ لفظ ''سکتا'' ہمیشہ مشروط اور امکانات کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور متذکرہ بالا حقیقت کے امکانات بہر حال، ہر دور میں رہے ہیں اور جب تک انسان کی پیدائش کا عمل جاری ہے، یہ امکانات موجود رہیں گے۔ یہ دنیا اور اس میں پائی جانے والی ہر شے کے وجود کا انحصار امکانات ہی کا رہینِ منت ہے۔ اس مشروط حقیقت کو تسلیم کریں یا نہ کریں، یہ ایک الگ اور طولانی بحث ہے، تاہم اس سے حقائق کی صحت متاثر نہیں ہوتی اور یہی سب سے بڑی سچائی ہے!

اس مختصر سی تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

ان دنوں میں ضلع گوجرانوالہ کے ایک تھانے میں تعینات تھا۔ یہ تھانہ صدر کہلاتا تھا اور لاری اڈے کے قریب ہی واقع تھا۔ تھانے کے پہلو میں گورنمنٹ ہائی اسکول کی عمارت تھی۔ وہ جاتی ہوئی سردیوں کے دن تھے۔ ماہ فروری کا وسط چل رہا تھا۔ ایک روز میں حسبِ معمول تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو پتا چلا کہ نواحی گاؤں ''پپلی والا'' میں قتل کی ایک واردات ہوگئی ہے۔ موضع پپلی والا میرے تھانے کی جنوب مشرقی سمت میں واقع تھا اور وہاں تک پہنچنے کے لیے نہر اپر چناب کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ پپلی والا میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔

میں نے اطلاع کنندہ کا نہایت ہی مختصر سا انٹرویو کیا اور کانسٹیبل حشمت اللہ سے کہا۔

''حشمت! پپلی والا جانے کی تیاری کرو.....''

''اچھا ملک صاحب!'' اس نے فرماں برداری سے کہا اور میرے کمرے سے رخصت ہوگیا۔

اطلاع لے کر آنے والے شخص کا نام محمد طفیل تھا۔ وہ پپلی والا ہی کا رہنے والا تھا اور رشتے میں وہ مقتول کا چاچا لگتا تھا۔ طفیل کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی۔ طفیل کی زبانی مجھے پتا چلا کہ مقتول کا نام انوار علی تھا اور وہ ضلع سیالکوٹ میں واقع کھیلوں کا سامان تیار کرنے والے ایک کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اس نے اپنی رہائش بھی سیالکوٹ ہی کے ایک محلے میں رکھی ہوئی تھی۔ انوار علی مہینے، ڈیڑھ مہینے میں اپنے گھر والدین سے ملنے آیا کرتا تھا۔

میں طفیل کے ساتھ بات چیت میں مصروف ہی تھا کہ کانسٹیبل حشمت دروازے میں نمودار ہوا پھر طفیل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''چاچا..... باہر تانگا تمہارا کھڑا ہے؟''

''جی..... وہ میرا ہی تانگا ہے۔'' طفیل نے جواب دیا۔

''ملک صاحب!'' کانسٹیبل نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بتایا۔ ''سواری کا بندوبست تو ہوگیا جناب۔ اب نکلنے کی تیاری کریں۔ ہم طفیل ہی کے تانگے میں بیٹھ کر پپلی والا جائیں گے.....''

میں نے سوالیہ نظر سے طفیل کو دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا تم سالم تانگا کر کے پپلی والا سے یہاں پہنچے ہو.....؟''

''نہیں جناب! یہ میرا ذاتی تانگا ہے۔'' طفیل نے بتایا۔ ''میں تانگا چلاتا ہوں..... یہی میرا رزق روزگار ہے.....!''

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے ایک سکون بھری سانس خارج کی۔

✠ ✠ ✠

ہم طفیل کے تانگے پر سوار ہو کر پپلی والا کی جانب جا رہے تھے۔ ''ہم'' سے میری مراد ہے میں، کانسٹیبل حشمت اور خود طفیل جو ایک ماہر کوچوان کی طرح تانگا ''ڈرائیو'' کر رہا تھا۔ میرے تھانے اور پپلی والا میں اچھا خاصا فاصلہ ہے۔ جی ٹی روڈ سے کچا ایمن آباد روڈ نکل کر سیدھا ایمن

آباد تک جاتا ہے۔ کسی زمانے میں جب تک پکا جی ٹی روڈ نہیں بنا تھا، گوجرانوالہ سے ایمن آباد تک جانے کے لیے یہی کچا ایمن آباد روڈ استعمال کیا جاتا تھا۔ موضع پپلی والا اسی روڈ پر نہر کی دوسری طرف واقع تھا۔ ''روڈ'' کو مذکر ہونا چاہیے یا مونث، اس بحث میں الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ابھی جہاں کا ذکر ہو رہا ہے وہاں روڈ مذکر ہی مستعمل ہے۔

آدھے گھنٹے کے بعد، ہم جائے وقوعہ پر تھے۔ میں نے دیکھا کہ نہر کے کنارے پر کوئی درجن بھر لوگ جمع تھے۔ ہم تانگے سے اتر کر ہجوم والی جگہ پر پہنچ گئے۔ وہاں پر موجود افراد ہمیں دیکھ کر اِدھر اُدھر ہو گئے..... میں جلدی سے نوجوان انوار کی لاش کی طرف بڑھا۔ ''لاش'' کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ پہلی ہی نظر میں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس نوجوان کو زندوں میں شمار کرنا سراسر حماقت ہوگی۔ انوار علی نامی اس نوجوان کی لاش نہر کے کنارے پل کے قریب ہی پڑی تھی۔

''انوار'' نے بادامی رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور پاؤں میں تسموں والے بند سیاہ جوتے تھے۔ قمیص کے اوپر اس نے پورے بازوؤں والا سوئٹر پہن رکھا تھا۔ جس کی تیاری میں نیلی اور سرخ اون کا استعمال کیا گیا تھا۔ نوجوان کی عمر کا اندازہ میں نے پچیس کے آس پاس قائم کیا جو بعد ازاں بالکل درست ثابت ہوا۔ انوار نے وحید مراد اسٹائل میں بال سیٹ کروا رکھے تھے۔ قد کاٹھ اور رنگ روپ کی مناسبت سے بھی وہ وحید مراد کے بہت قریب تھا۔ پتا نہیں، فلم انڈسٹری والوں کی اس پر نظر کیوں نہیں پڑی تھی ورنہ وہ کسی کارخانے میں کھیلوں کا سامان نہ بنا رہا ہوتا!

مقتول کی موت کا سبب جاننے میں مجھے قطعاً کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ اس کی کھوپڑی اور چہرہ، ہاتھ پاؤں اس ظلم کی کہانی سنانے کے لیے کافی تھے جس سے گزرنے کے بعد وہ موت کے منہ میں گیا تھا۔ میں ایک لمحے میں سمجھ گیا کہ اس کے سر پر ڈنڈے سوٹے برسا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں اور کندھوں کی چوٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے خود کو بچانے کی، اپنی سی کوشش کی تھی لیکن حملہ آوروں نے اس کی پیش نہیں چلنے دی تھی۔ میں نے یہاں پر ''حملہ آوروں'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ میرے ماہرانہ اندازے کے مطابق انوار کے دشمنوں کی تعداد ایک سے زیادہ تھی۔ وہ کم از کم دو یا اس سے زیادہ تھے جب ہی اس بدنصیب کو سنبھلنے یا وہاں سے فرار ہونے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس کی کھوپڑی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ چہرے کے مختلف

حصوں پر بھی ابھرے ہوئے کھلے زخم نظر آ رہے تھے۔ایک محتاط اندازے کے مطابق اس کی موت کو دس سے بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ یہ حقیقت سمجھنے کے لیے کسی اسپیشل عقل کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ شدید ترین دشمنی کا نشانہ بنا تھا۔

لاش کے معائنے کے بعد میں نے اس کی جامہ تلاشی بھی لی۔اس کے لباس میں سے ایک چیک دار رومال، ایک چھوٹی کنگھی، عطر کی شیشی، ایک سو پچاس روپے نقدی وغیرہ برآمد ہوئی۔ علاوہ ازیں ایک اندرونی جیب میں سے ڈاک کا ایک لفافہ بھی ہاتھ لگا، میں نے سرِ دست مذکورہ لفافے کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔

موقع کی ضروری کارروائی کرنے کے بعد میں نے انوار علی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوایا اور وہاں پر موجود لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔سب سے پہلے میں نے اس شخص سے سوال جواب کیا جس نے آج صبح انوار کی لاش دریافت کی تھی۔اس کا نام رمضان عرف رمضانی تھا۔رمضانی کی عمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی تاہم وہ صحت اور ہاتھ پاؤں کا مضبوط نظر آتا تھا۔وہ ایک چھوٹا زمیندار تھا۔

''ہاں رمضانی چاچا!'' میں نے براہِ راست اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔''تم نے کب اور کس حالت میں مقتول کو دیکھا تھا؟''

''حالت تو یہی تھی جناب، جیسی آپ نے دیکھی ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔''اور .....میں نے انوار کی لاش کو آج صبح سویرے دیکھا تھا۔''

''صبح سویرے تم نہر کے کنارے پر کیا کر رہے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''جناب! میں زمیندار ہوں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''روزانہ صبح سویرے ہی اٹھ کر زمینوں کی طرف جاتا ہوں لیکن آج میں کہیں اور جا رہا تھا؟''

''اور کہاں.....؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اس نے بتایا۔''ادھر کھیالی میں میری چھوٹی بہن رضیہ رہتی ہے۔میں اس کے لیے ایک بوری چاول لے کر کھیالی جا رہا تھا لیکن جیسے ہی میں نہر کے پل کے پاس پہنچا، انوار کی لاش نے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں چادلوں والی بوری کے ساتھ سیدھا صدیق کی دکان پر پہنچا اور اسے صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔''

''صدیق.....کون؟'' میں نے سوالیہ نظر سے رمضانی کو دیکھا۔

رمضانی کے کچھ بولنے سے پہلے طفیل نے جواب دیا۔''جناب! صدیق میرے بڑے بھائی کا نام ہے۔ادھر پہلی والا ہی میں اس کی پرچون کی دکان ہے۔انوار، صدیق کا بیٹا تھا.....''

''کیا مقتول کا باپ صدیق یہاں پر موجود ہے.....؟'' میں نے وہاں پر موجود لوگوں کو باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں جناب!'' طفیل نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔''بھائی صدیق کو میں گھر پر چھوڑ کر آپ کی طرف گیا تھا۔آپ کہیں تو اسے یہاں بلا لیتا ہوں.....'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔''کیا ہوا طفیل! تم بولتے بولتے اچانک رک کیوں گئے؟''

''وہ جناب..... بھائی صدیق کی حالت بہت خراب ہے۔'' وہ درخواست آمیز انداز میں بولا۔''جوان بیٹے کی حسرت ناک موت نے اس کے دل و دماغ پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔میں نے اسی لیے اسے وقوعہ سے ہٹا کر گھر بھیج دیا تھا.....''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔''میں یہاں سے فارغ ہونے کے بعد خود صدیق کے گھر جاؤں گا۔اس سے جو بھی پوچھنا ہوگا، میں وہیں پر پوچھ لوں گا۔''

''بہت بہت شکریہ جناب!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔''میں بھی یہی چاہ رہا تھا۔''

میں دوبارہ رمضانی کی طرف متوجہ ہوگیا۔''ہاں چاچا! صدیق کو اس واقعے کی اطلاع دینے کے بعد تم نے کیا کیا تھا؟''

''کچھ نہیں سرکار! ابھی تک تو میں ادھر ہی ہوں۔آپ اجازت دیں گے تو کھیالی چلا جاؤں گا۔'' اس نے بتایا۔''جب طفیل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تھانے اطلاع دینے جا رہا ہے تو میں خود ہی رک گیا تھا۔مجھے پتا تھا کہ پولیس پوچھ گچھ کے لیے سب سے پہلے مجھے ہی تلاش کرے گی.....''

''واہ بھئی چاچا رمضانی.....!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''تم پولیس کے مزاج کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہو.....؟''

''مائی باپ.....!'' وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔''میں ادھر پپلی والا میں پچھلے چار پانچ سال سے ہوں۔اس سے پہلے میں ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔آپ جانتے ہیں، شیخوپورہ تو ویسے بھی جرائم کے حوالے سے پنج آب کے سرِفہرست شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے بعد اوکاڑہ کا نمبر آتا ہے۔میں.....!''

''تو کیا پہلے تم کوئی مجرم شجرم ہوا کرتے تھے.....؟'' میں نے اس کی اوکاڑہ اور شیخوپورہ کی تفصیل سننے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔''اللہ نہ کرے سرکار.....میں تو آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ ہمارے گاؤں کا ایک گبرو ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو گیا تھا۔اس گبرو کے ماں باپ اور بہن بھائی ادھر گاؤں ہی میں تھے لہٰذا جب بھی پولیس کا جی چاہتا، وہ اس گبرو کی گرفتاری کے لیے گاؤں آ جاتی تھی۔اس طرح پولیس والوں کو قریب سے دیکھنے اور ان کے طریقہ کار کو سمجھنے کا موقع ملتا رہا.....بس اتنی سی بات ہے جناب!''

''یہ اتنی سی بات بھی بڑی اہم بات ہے رمضانی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔''تم انوار کے قتل کے حوالے سے اگر کچھ جانتے ہو تو مجھے بتاؤ؟''

''نہیں جناب، میں اس واردات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''یہ تو سیالکوٹ کی کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔مجھے تو یہ بھی نہیں پتا، یہ واپس کب آیا ہے.....''

''ٹھیک ہے رمضانی! میں تم سے بعد میں تفصیلی بات کروں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''تم بڑے کام کے آدمی ہو.....''

''تو کیا..... مجھے جانے کی اجازت ہے؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔''آج یہ چاولوں کی بوری کھیالی پہنچانا ضروری ہے۔''

بات ختم کرتے ہی رمضانی نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔میں نے اس سمت نگاہ دوڑائی تو شیشم کے ایک درخت کے نیچے مجھے ایک گدھا کھڑا دکھائی دیا جس کی کمر پر اناج سے بھری ہوئی

ایک بوری لدی تھی یقیناً اس بوری کے اندر چاول بھرے ہوں گے۔ پبلی والا سے کھیالی جانے کے بعد نہر کا کنارہ سب سے آسان اور سیدھا راستہ تھا۔ میں نے رمضانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں جانے کی پوری اجازت ہے چاچا، کیا کھیالی سے تم آج ہی واپس آ جاؤ گے؟''

''جی ہاں..... میں شام سے پہلے واپس آ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم آج کسی وقت یا پھر کل تھانے آ کر مجھ سے ملو، میں تم سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے تھانے آ کر مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا پھر سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

میں وہاں موجود دیگر افراد سے پچھ پرتیت میں مصروف ہو گیا۔ لگ بھگ بیس منٹ کی انکوائری کے بعد بھی کام کی کوئی بات سامنے نہ آ سکی تو میں نے محمد طفیل سے کہا۔ ''تم مجھے مقتول کے گھر لے چلو۔ میں اس کے باپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ آئیں جی میرے ساتھ.....!'' وہ اپنے تانگے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

کانسٹیبل حشمت اللہ کو میں نے مقتول کی لاش کے ہمراہ اسپتال بھیج دیا تھا۔ میں طفیل کے تانگے میں بیٹھا اور صدیق کے گھر کی جانب چل پڑا۔

✠ ✠ ✠

ہم اس وقت صدیق پرچون والے کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔

صدیق کی عمر لگ بھگ پچپن سال رہی ہو گی۔ وہ دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ جوان بیٹے کی المناک موت نے اسے بری طرح نڈھال کر رکھا تھا۔ اس کی بیوی اللہ رکھی بھی گھر کے اندرونی حصے میں صدمہ جاں کاہ سے گزر رہی تھی۔ محلے کی کوئی نصف درجن عورتیں بھی گھر میں بھری ہوئی تھیں جو یقیناً اللہ رکھی سے تعزیت کرنے آئی تھیں۔ طفیل کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ صدیق کی صرف دو ہی اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا انوار اور اس سے چھوٹی بہن کوثر جو بارہ تیرہ سال کی تھی۔ بھائی کی موت نے کوثر کو اکیلا کر دیا تھا۔ وہ بڑی افسردہ اور ملول نظر آتی تھی۔ میں نے ہمدردی بھرے انداز میں مقتول کے باپ سے کہا۔ ''صدیق! تمہارے بیٹے کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا مجھے

بے حد افسوس ہے۔ میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں.....''

''بڑی مہربانی ہے آپ کی.....!'' وہ دل شکستہ انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔''صدیق! میں تمہارے بیٹے کو تو واپس نہیں لا سکتا لیکن یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں انوار کے قاتل کو جب تک عبرت ناک سزا نہیں دلوا دوں گا، چین سے نہیں بیٹھوں گا لیکن اس کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہوگی.....!''

اس نے زخمی نظر سے مجھے دیکھا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔''ہمارا تو سب کچھ لٹ گیا جناب.....جوان بیٹے کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں.....!''

''مجھے تمہارے صدمے کا بہ خوبی احساس ہے صدیق۔'' میں نے دل جوئیانہ انداز میں کہا۔''اسی لیے تو میں تم سے تعاون کی اپیل کر رہا ہوں۔ میں تمہاری مدد کے بغیر انوار کے قاتل تک نہیں پہنچ سکتا۔''

''جی حکم کریں.....میں آپ سے کیا تعاون کروں؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''صدیق! تمہارے بیٹے کو جس انداز میں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی کسی سے شدید نوعیت کی دشمنی تھی۔ تم مجھے بتاؤ کہ ایسا کون شخص ہو سکتا ہے جو انوار کی جان کا دشمن ہو؟''

''جناب.....انوار تو بہت ہی سیدھا سادا اور شریف لڑکا تھا۔'' صدیق نے بتایا۔''یہاں تو کسی سے اس کی دشمنی نہیں تھی۔''

''یہاں نہیں تو پھر کہیں اور ہوگی.....'' میں نے پُر سوچ انداز میں کہا۔''یہ کسی دوست کا تو کام ہو نہیں سکتا۔ انوار کو جتنی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ قاتل کو اس سے شدید نفرت تھی؟''

''میرا دماغ تو بالکل کام نہیں کر رہا.....'' وہ پریشان نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے پتا چلا ہے، تمہارا بیٹا ادھر سیالکوٹ میں، کھیلوں کا سامان بنانے والے کسی کارخانے میں کام کرتا تھا۔'' میں نے دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔''یہ بھی تو ہو سکتا ہے، کوئی دشمن پیچھے ہی سے اس کے ساتھ یہاں تک آیا ہو۔ تمہیں انوار کے سیالکوٹ کے حالات اور معاملات کا

کچھ علم ہے.....؟''

''نہیں جی، کچھ زیادہ پتا نہیں۔'' وہ مایوسی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بس اتنا جانتا ہوں، انوار نے ادھر سیالکوٹ ہی میں کرایے پر ایک کمرا لے رکھا تھا اور وہاں رہتا تھا۔ وہ مہینے، ڈیڑھ مہینے یا کبھی دو مہینے کے بعد ہم سے ملنے آتا تھا اور دو چار دن رہ کر واپس سیالکوٹ چلا جاتا تھا۔ وہ کسی بیوہ کا گھر ہے جس کا ایک کمرا انوار نے کرایے پر لے رکھا تھا۔'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''بس جی..... میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''کیا وہ کرایے کے کمرے میں اکیلا ہی رہتا تھا یا کوئی ساتھی سنگی بھی اس کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا؟''

''انوار نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے ساتھ صفدر نامی ایک بندہ بھی رہتا ہے۔'' صدیق نے جواب دیا۔ ''یہ صفدر وزیر آباد کا رہنے والا ہے اور کھیلوں کا سامان تیار کرنے والے کارخانے میں انوار کے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔''

میں نے صدیق سے مذکورہ کارخانے اور متذکرہ بالا بیوہ کے گھر کا ایڈریس لے لیا اور کہا۔ ''ٹھیک ہے صدیق..... میں سیالکوٹ جا کر صفدر سے بھی پوچھ گچھ کروں گا۔''

وہ زخمی نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

مجھے رمضانی چاچا کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ گئی۔ رمضانی نے مقتول کی پپلی والا میں آمد سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے تناظر میں، میں نے صدیق سے پوچھ لیا۔ ''کیا تمہیں یہ معلوم تھا کہ انوار پپلی والا آنے والا ہے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''وہ اپنی آمد کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتاتا تھا۔ بس جب بھی اس کا دل چاہتا، وہ ہم سے ملنے چلا آتا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، تمہیں انوار کی آمد کے بارے میں کوئی معلومات نہیں تھیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی، بالکل نہیں!'' وہ پوری قطعیت سے بولا۔

''پپلی والا میں کوئی اور شخص یہ بات جانتا ہو؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں

پوچھا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''جب ہمیں نہیں پتا تو کسی اور کو کیسے خبر ہو سکتی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے.....'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''اس بات کے روشن امکانات ہیں کہ قاتل کا تعلق پپلی والا سے نہیں بلکہ وہ کہیں باہر سے آیا تھا..... ''آئے تھے'' کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ میرے اندازے کے مطابق حملہ آوروں کی تعداد دو یا دو سے زیادہ تھی۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے تھانیدار صاحب!'' طفیل نے اس گمبھیر گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''انوار کے زخموں کی تعداد اور سنگینی سے بالکل یہی اندازہ ہوتا ہے.....!''

''اور.....'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''زخموں کی حالت اور ان پر جمے ہوئے خون سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انوار کو پچھلی رات کے ابتدائی حصے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے..... رات کے دس بجے سے پہلے!''

طفیل تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

''طفیل! تم بھی تو تانگا چلاتے ہو۔ تمہارا روٹ وغیرہ کیا ہے؟''

''سرکار! عام طور پر گوندلاں والا اڈے سے لے کر پپلی والا تک تانگا چلاتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن اس روٹ میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔''

''مثلاً کس قسم کی تبدیلی؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

گوندلاں والا اڈا میرے تھانے سے شمال میں واقع تھا۔ یہ سارے مقامات اسی جی ٹی روڈ پر واقع تھے جو لاہور سے راولپنڈی تک ''جاتا'' تھا۔ تھانے کے بعد لاری اڈا تھا۔ پھر شیراں والا باغ، ریلوے اسٹیشن اور اڈا گوندلاں والا۔ تھوڑا آگے جائیں تو بسوں کا بڑا اڈا یعنی جنرل بس اسٹینڈ آتا تھا۔ میرے تھانے سے ملحق جو لاری اڈا تھا اسے عرفِ عام میں شیخوپورہ موڑ بھی کہا جاتا تھا۔ کیونکہ وہاں سے ایک سڑک شیخوپورہ اور (فیصل آباد) لائل پور کے لیے نکلتی تھی۔ تھانے سے جنوب کی سمت یعنی لاہور کی طرف بڑھیں تو تھوڑے ہی فاصلے پر ایک کچا راستہ بائیں جانب نکلتا ہے جو کچا ایمن آباد روڈ کہلاتا ہے۔ یہی راستہ پپلی والا اور ہندو چک سے گزرتے ہوئے سیدھا ایمن آباد تک

جاتا ہے۔

طفیل نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ''تھانے دار جی! جب میں صبح پپلی والا سے نکلتا ہوں تو زیادہ تر سواریاں شیراں والا باغ تک کی ہوتی ہیں یا پھر راستے میں اترنے والی۔ اگر اس دوران میں آگے کی کوئی سواری مل جاتی ہے تو میں اسے بھی اٹھا لیتا ہوں لیکن زیادہ سے زیادہ گوندلاں والا اڈے تک کی۔ میں اس سے زیادہ آگے نہیں جاتا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما، ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اسی طرح واپسی میں بھی تھوڑی تبدیلی چلتی رہتی ہے۔ مجھے شام تک گھر آنا ہوتا ہے۔ میں اسی حساب سے سواریاں اٹھاتا ہوں کہ مغرب کی اذان تک میں اپنے گھر پہنچ جاؤں لیکن کبھی کبھار تانگے میں ایک آدھ سواری ہندو چک کی بھی ہوتی ہے تو میں اسے چھوڑنے ہندو چک بھی چلا جاتا ہوں۔ ہندو چک پپلی والا سے تھوڑا آگے ہے۔''

میں طفیل کی زبان سے یہ ساری تفصیل صبر وسکون سے محض اس لیے سن رہا تھا کہ مجھے اس میں سے بہت کچھ اخذ کرنا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے سوال کیا۔

''طفیل! تم نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ شام تک کام ختم کر کے تم اپنے گھر پہنچ جاتے ہو۔ کیا پچھلی شام کو بھی تم اپنے مقررہ وقت پر ہی گھر آئے تھے؟''

''جی.....'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''کل شام میں چھ بجے گھر پہنچ گیا تھا۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گوجرانوالہ سے سیالکوٹ آنے اور جانے کے لیے عموماً دو روٹ کی بسیں چلتی ہیں۔ ایک تو لاہور سے سیالکوٹ اور دوسری لائل پور (فیصل آباد) سے سیالکوٹ۔ یہ بسیں شیخوپورہ موڑ سے ہو کر گزرتی ہیں یعنی میرے تھانے کی بغل میں سے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا.....؟''

''نہیں جناب..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''مقتول انوار سیالکوٹ کے ایک کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اس کا مطلب ہے، وہ سیالکوٹ سے لائل پور جانے والی بس میں یا پھر لاہور جانے والی بس میں بیٹھ کر گوجرانوالہ آیا ہوگا اور لاری اڈا شیخوپورہ موڑ پر وہ بس سے اترا ہوگا۔ میں اگر غلط کہہ رہا ہوں تو مجھے ٹوک دینا.....!''

''جناب.....آپ کچھ بھی غلط نہیں کہہ رہے۔'' طفیل نے تصدیقی انداز میں کہا۔

''بالکل ایسا ہی ہوا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے طفیل!' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''اور تم یہ بھی تسلیم کرو گے کہ شیخوپورہ موڑ سے پپلی والا تک پہنچنے کے لیے صرف تانگا ہی واحد ذریعہ آمد و رفت ہے.....؟''

''جی ہاں.....یہ بات سچ ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''لیکن بعض لوگ بڑے مہم جو ہوتے ہیں، وہ پیدل بھی چل پڑتے ہیں۔''

''تمہارے خیال میں اگر شیخوپورہ موڑ سے پیدل چلنا شروع کریں تو کتنی دیر میں پپلی والا پہنچ جائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈیڑھ، دو گھنٹے تو لگیں گے ہی.....'' اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

''اور تانگے پر سوار ہو کر آئیں تو.....؟''

''بیس پچیس منٹ.....یا زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا!''

''تم کیا سمجھتے ہو، انوار پاؤں پاؤں چلتے ہوئے شیخوپورہ موڑ سے پپلی والا آیا ہوگا؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔''انوار تو ہمیشہ تانگے میں بیٹھ کر ہی آیا کرتا تھا۔''

''طفیل بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے تھانے دار صاحب!'' صدیق بھی ہمت کر کے ہماری گفتگو میں شامل ہو گیا۔''پیدل چلنے سے انوار کی جان جاتی تھی۔ وہ تو تھوڑے تھوڑے فاصلے کے لیے بھی سائیکل اور تانگے کا سہارا ڈھونڈا کرتا تھا۔ شیخوپورہ موڑ سے پپلی والا تک پیدل آنا اس کے لیے ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ کسی تانگے میں بیٹھ کر ہی آیا ہوگا.....''

''اور وہ تانگا طفیل کا نہیں ہو سکتا.....؟'' میں نے سوالیہ انداز میں طفیل کی آنکھوں میں دیکھا۔

وہ جلدی سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ میں کل شام چھ بجے گھر آیا تھا اور اس وقت تک انوار پپلی والا نہیں پہنچا تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ بعد میں کسی اور تانگے میں بیٹھ کر آیا ہوگا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا پپلی والا میں کوئی اور شخص بھی تانگا چلاتا ہے؟''

''جی نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ادھر تو میں اکیلا ہی تانگے والا ہوں لیکن.....!''

''لیکن کیا.....؟'' وہ یک دم رکا تو میں نے پوچھا۔

''ادھر ہندو چک میں عبدالغنی نامی ایک بندہ بھی تانگا چلاتا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''غنی میرے بعد ہی واپس آتا ہے۔ ہوسکتا ہے، انور کل شام یا رات کو غنی کے تانگے میں بیٹھ کر پپلی والا پہنچا ہو.....''

''ہاں ایسا ہوسکتا ہے.....!'' میں نے پُرسوچ انداز میں گردن ہلائی پھر کہا۔ ''میرے محتاط اندازے کے مطابق مقتول انوار کو گزشتہ رات آٹھ اور دس بجے کے درمیان موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ کل رات کم از کم آٹھ بجے اور زیادہ سے زیادہ نو بجے پپلی والا پہنچا تھا۔ اگر وہ عبدالغنی کے تانگے پر سوار ہو کر آیا تھا تو بالکل درست وقت کی تصدیق غنی کو چوان سے ہوسکتی ہے۔ میرے خیال میں، وہ اس معاملے میں کام کا بندہ ثابت ہوگا۔ طفیل! تم ایک کام کرو.....'' میں نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم جلدی سے جا کر غنی کو بلا لاؤ۔ جب تک میں تمہارے بھائی صدیق سے بات کرتا ہوں۔''

''میں کوشش کرتا ہوں جناب۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میرا خیال ہے وہ اس وقت تک تانگا لے کر نکل چکا ہوگا.....!''

''تم کوشش کر کے دیکھ لو، باقی اللہ مالک ہے!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ اگر گھر سے نکل بھی چکا ہے تو جائے گا کہاں، رات کو تو اسے واپس آنا ہی ہوگا!''

طفیل مجھے سلام کر کے صدیق کے گھر سے نکل گیا۔

''میں نے جوان مقتول کے غم زدہ باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''صدیق! تم نے اپنے بیٹے کی لاش کو غور سے دیکھا تھا نا.....؟''

''جی..... جی ہاں!'' وہ مختصر سا جواب دے کر خاموش نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''اس کے سر اور جسم کے دوسرے حصوں کو جتنی بے دردی سے نشانہ بنایا گیا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حملہ آور اس سے بڑا گہرا عناد رکھتے تھے اور تم بتا رہے ہو،

اس کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ نہیں تھی۔اب جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے.....یہی ہوسکتا ہے کہ قاتل اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہوں لیکن ایک سوال پھر بھی پیاسا رہ جاتا ہے کہ آخر کسی کو تمہارے بیٹے سے دشمنی کیا تھی۔تمہارے ذہن میں اس حوالے سے کوئی بات آتی ہے صدیق؟''

''جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ قدرے سنبھلے ہوئے انداز میں بولا۔''مجھے تو یہ لوٹ مار کی واردات لگتی ہے.....!''

''لوٹ مار.....؟'' میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

صدیق نے کافی اہم نکتہ اٹھایا تھا۔میرے استفسار کے جواب میں صدیق نے بتایا۔

''انوار جب بھی ہم سے ملنے آتا تھا تو اس کے ہاتھ میں ایک سفری بیگ بھی ہوا کرتا تھا جس میں اس کے استعمال کے کپڑے اور دوسرا سامان رکھا رہتا تھا لیکن اس بار وہ بیگ کہیں نظر نہیں آ رہا، میں جب اطلاع پا کر ادھر نہر کی جانب گیا تھا تو میں نے انوار کی لاش کے آس پاس اس بیگ کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ مجھے ملا نہیں اس لیے.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس لیے میرا دھیان لوٹ مار کی طرف جا رہا ہے، ہوسکتا ہے، کوئی آدمی سیالکوٹ سے انوار کے پیچھے لگ گیا ہو یا پھر یہ بھی ممکن ہے، کوئی بندہ شیخوپورہ موڑ سے اس کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا ہو اور پھر جب انوار پپلی والا پہنچ کر تانگے سے اترا تو اسے موقع مل گیا.....!''

صدیق جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوا تو میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔''دیکھو صدیق! اگر صرف اس بات پر غور کیا جائے کہ کسی نے انوار کا بیگ چھیننے کے لیے اسے موت کے گھاٹ اتارا ہے تو پھر اس امکان کو خارج کرنا ہوگا کہ مذکورہ بندہ سیالکوٹ سے اس کے پیچھے لگ کر یہاں تک پہنچا ہوگا البتہ.....شیخوپورہ موڑ سے تانگے میں، ساتھ بیٹھ کر یہاں پہنچنے والی بات سمجھ میں آتی ہے۔'' میں نے تھوڑا وقفہ کر کے صدیق کی آنکھوں میں دیکھا پھر پوچھا۔

''انوار کا سفری بیگ کس قسم کا تھا مجھے اس اس کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ؟''

صدیق نے بیگ کے حوالے سے مجھے جو معلومات فراہم کیں اس میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ مذکورہ بیگ گہرے نیلے رنگ کا تھا۔علاوہ ازیں اس بیگ کی خصوصیات تقریباً ہر سفری

بیگ میں پائی جاتی ہیں۔ بہر حال یہ ''لوٹ مار'' والا زاویہ قابلِ غور تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی تک میرا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔ میں نے صدیق کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تو قاتل کے حوالے سے تمہیں کسی خاص آدمی پر شک نہیں ہے؟''

''نہیں تھانے دار صاحب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

ہمارے درمیان بات ہو ہی رہی تھی کہ طفیل ہندو چک سے واپس آ گیا اور اس نے آ کر اطلاع دی کہ عبدالغنی دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس کی گھر والی نے طفیل کو بتایا تھا کہ غنی ناشتے کے فوراً بعد تانگا لے کر گھر سے نکل گیا تھا۔ اس کی واپسی اب رات ہی کو متوقع تھی۔ طفیل کے خاموش ہونے پر میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''طفیل! میں تمہیں ایک ذمے داری سونپ رہا ہوں!''

''جناب.....!'' وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ''حکم کریں تھانے دار صاحب؟''

''یہ جو کوچوان عبدالغنی ہے نا، اس کا تم نے خیال رکھنا ہے.....!''

''کس قسم کا خیال جی؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے جواب دینے سے پہلے ایک امر کی تصدیق ضروری جانی اور اس سے پوچھا۔

''کیا آج تم تانگا نکالنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''گھر میں جوان بیٹے کی موت کا سوگ منایا جا رہا ہے، تانگا نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کم از کم قل (سوئم) تک تو ہم کاروبار بند رکھیں گے۔ میں تانگا نکالوں گا اور نہ ہی بھائی صدیق اپنی دکان کھولے گا.....!''

صدیق کی پرچون کی دکان گھر کے سامنے والے حصے میں تھی۔ میں جب صدیق سے ملنے آیا تو میں نے دکان کا دروازہ بند دیکھا تھا۔ طفیل کی وضاحت کے بعد میں نے اس سے کہا۔

''تم جب تک جی چاہے، کاروبار بند رکھو لیکن آج ہی تمہیں ایک ضروری کام کرنا ہے اور.....وہ کام ہے عبدالغنی کوچوان کو اپنے ساتھ لے کر میرے پاس تھانے آنا۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی تفتیش کا رخ متعین کرنے سے پہلے غنی سے ایک ملاقات ضرور کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس بات کی تصدیق ہو جائے کہ مقتول انوار پچھلی رات اس کے تانگے پر سوار ہوا تھا یا نہیں۔''

''ٹھیک ہے جناب!''طفیل نے بڑی فرماں برداری سے کہا۔''میں ابھی تانگا لے کر غنی کی تلاش میں نکلتا ہوں۔ آپ کو تھانے پہنچانے کے بعد میں اسے ڈھونڈوں گا اور وہ جیسے ہی نظر آیا، میں اسے آپ کے پاس لے آؤں گا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ہمیں راستے میں کہیں مل جائے.....!''

''اگر ایسا ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہے۔''میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر صدیق کی جانب دیکھتے ہوئے تسلی بھرے لہجے میں اضافہ کیا۔

''صدیق! تم اپنے اندر حوصلہ اور ہمت پیدا کرنے کی کوشش کرو، میں جانتا ہوں، جوان بیٹے کی الم ناک موت کو برداشت کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ انوار کا قاتل یا انوار کے قاتل بہت جلد آہنی سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔''

''اچھا جی.....!''وہ روہانسی آواز میں بولا۔ پھر پوچھا۔''اسپتال والے انوار کی لاش کب تک دیں گے؟''

''کل دوپہر تک..... یا زیادہ سے زیادہ شام تک۔''میں نے جواب دیا۔

اس نے گردن جھکا دی۔

میں صدیق کے گھر سے نکلا اور طفیل کے تانگے میں بیٹھ کر تھانے کی سمت روانہ ہو گیا۔ کچا ایمن آباد روڈ پر سفر کے دوران میں عبدالغنی کوچوان یا اس کا تانگا ہمیں کہیں نظر نہ آیا۔ تھانے پہنچ کر میں تانگے سے اترا اور طفیل نے غنی کی تلاش میں تانگا آگے بڑھا دیا۔

✠ ✠ ✠

دوپہر کے دو بجے تھے۔ میں دن کے کھانے اور نماز ظہر سے فارغ ہوا ہی تھا کہ طفیل، غنی کو لے کر میرے پاس آ گیا۔ عبدالغنی کوچوان کی عمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے بیشتر بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ ایک معقول صورت اور خوش اخلاق شخص تھا۔ میں نے فوراً ان دونوں کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ جب وہ میرے سامنے بیٹھ چکے اور ہمارے درمیان رسمی علیک سلیک کا مرحلہ بھی طے ہو گیا تو میں نے غنی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''عبدالغنی! تمہیں طفیل نے یہ تو بتا ہی دیا ہوگا کہ میں نے کیوں بلایا ہے؟''

''جی تھانے دار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے انوار کی موت کا بڑا دکھ ہوا ہے جی، وہ کل میرے تانگے ہی میں بیٹھ کر پپلی والا آیا تھا۔ میں نے یہ بات طفیل کو بتائی ہے۔ طفیل نے جب مجھے انوار کی موت کے بارے میں بتایا تو مجھے بالکل یقین نہیں آیا جناب۔ وہ کل شام تک تو بھلا چنگا تھا۔ پتا نہیں، کس بد بخت نے اسے موت کی نیند سلا دیا ہے۔'' اس نے مزید کہا۔

''اس واقعے کا صبح ہی پتا چل جاتا تو یقین جانیں، میں آج تانگا نہیں نکالتا۔ خدا غارت کرے اس کمینے شخص کو جس نے انوار کی جان لی ہے.....''

''میں اسی بد بخت اور کمینے شخص کی تلاش میں ہوں عبدالغنی!'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''جناب! آپ اس ذلیل انسان کو صرف تلاش ہی نہ کریں بلکہ اسے ایسی سزا دیں کہ آئندہ کسی دوسرے شخص کو ایسی حرکت کرنے کی ہمت نہ ہو۔'' غنی کوچوان نے بڑے جوش بھرے انداز میں کہا۔ ''پتا نہیں، ایسے ظالم اور سفاک لوگوں کو اللہ نے اتنی کھلی چھوٹی کیوں دے رکھی ہے.....؟''

ایک حقیقت کا اندازہ مجھے فوراً سے پیشتر ہو گیا کہ عبدالغنی نہایت ہی باتونی اور جوشیلا بندہ تھا۔ اس کی طویل تقریروں سے بچنے کا ایک ہی فارمولا تھا کہ اسے کم سے کم بولنے کا موقع دیا جائے۔ میں نے اسے سوالات کی باز پر رکھ لیا۔

''اچھا تو عبدالغنی..... وہ کل تمہارے تانگے میں بیٹھ کر پپلی والا پہنچا تھا؟''

''جی..... میں اس وقت شیراں والا باغ کی طرف سے.....!''

''عبدالغنی اچھی طرح سوچ کر بتاؤ۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کل مقتول انوار کو کہاں سے اپنے تانگے میں بٹھایا تھا؟''

''اللہ آپ کا بھلا کرے جناب.....'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''میں نے انوار کو شیخوپورہ موڑ والے لاری اڈے سے اٹھایا تھا وہ.....''

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ ''اس وقت کیا بجا ہو گا جب انوار تمہارے تانگے میں بیٹھا تھا؟''

''اس وقت اچھا خاصا اندھیرا ہو رہا تھا جناب۔'' غنی کوچوان نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''سورج کو ڈوبے بھی لگ بھگ ایک گھنٹا ہونے والا تھا۔''

''آج کل یہاں گوجرانوالہ میں سورج پانچ بج کر پچاس منٹ پر غروب ہو رہا ہے اور چھ بجے مغرب کی نماز ادا کی جاتی ہے۔'' میں نے غنی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انوار کوئی سات بجے رات، شیخوپورہ موڑ سے تمہارے تانگے پر سوار ہوا تھا؟''

''بالکل یہی وقت ہونا چاہیے جناب۔'' اس نے تصدیقی انداز میں گردن ہلائی۔

''سات نہیں تو پھر پونے سات کا وقت ہوگا کیونکہ جب میں اپنے گھر ہندو چک پہنچا تو اس وقت رات کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ شیخوپورہ موڑ سے ہندو چک تک تانگے کا فاصلہ تیس چالیس منٹ سے زیادہ نہیں۔ میں تانگا کھڑا کر کے گھر گیا۔ کھانا ابھی تیار نہیں ہوا.....!''

''عبدالغنی!'' میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی تقریر کو بریک لگا دیے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''انوار شیخوپورہ موڑ سے اکیلا ہی تمہارے تانگے پر سوار ہوا تھا یا اس کے علاوہ بھی کوئی سواری بیٹھی تھی؟''

''او جی صاحب! تھانے دار اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بولا۔ ''جب میں شیراں والا باغ سے چلا تو.....''

''عبدالغنی! میں شیراں والا باغ نہیں، شیخوپورہ موڑ کی بات کر رہا ہوں.....؟'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''وہی تو میں آپ کو بتانے والا تھا جناب!'' وہ قدرے بیزاری سے بولا۔ ''آپ سنیں تو سہی.....!''

''ہاں، ہاں.....سناؤ!'' میں خاموش ہو کر گہری نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ سلسلہ معلومات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں شیراں والا باغ کے سامنے کھڑا سواریوں کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک نوجوان لڑکا سائیکل پر سوار ہو کر میرے پاس آیا اور کہا کہ چار بیبیوں کو ریلوے پھاٹک کے دوسری طرف کنہیالال باغ تک جانا ہے۔ تم لے جاؤ گے؟ میں سمجھ تو گیا تھا کہ وہ کس جگہ کی بات کر رہا ہے لیکن تصدیق کے لیے پھر بھی پوچھ لیا، تم کس پھاٹک کی بات کر

رہے ہو پتر؟ اس نے بتایا، وہ جو کچا ایمن آباد روڈ پر ہے۔ ریلوے پھاٹک کی دوسری طرف کنہیالال باغ ہے۔ یہ بیبیاں ادھر ہی اتریں گی۔ میں نے اس سے پوچھا، پتر! وہ چار بیبیاں ہیں کدھر۔ تم تو اکیلے نظر آ رہے ہو؟ اس نے جواب دیا، وہ تھوڑا پیچھے لاہوری گیٹ کے سامنے کھڑی ہیں۔ چاچا! تم تانگے کو پیچھے لے آؤ۔ میں خالی کھڑا تھا۔ چار سواریوں کے لیے چند گز پیچھے جانے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ میں نے پانچ منٹ بعد ان چاروں عورتوں کو اپنے تانگے میں سوار کر لیا۔ ان میں ایک بوڑھی اور تین ادھیڑ عمر تھیں۔ تینوں ادھیڑ عمر تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں اور بوڑھی کو میں نے اگلی سیٹ پر بٹھا لیا تا کہ محفوظ رہے.....!''

وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو میں اپنی زبان کو روک نہ سکا۔ میں نے ترت پوچھا۔ ''اس کے بعد تو تانگا چل پڑا ہو گا؟''

''جی تھانے دار صاحب! تانگا چل پڑا تھا۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن شیخوپورہ موڑ پر مجھے ایک آدھ منٹ کے لیے تانگا روکنا پڑا تھا۔''

''شیخوپورہ موڑ سے انوار تانگے پر سوار ہوا ہو گا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے غنی کوچوان کی طرف دیکھا۔

''صرف انوار نہیں جناب!'' اس نے بتایا۔ ''وہاں سے انوار کے علاوہ ایک اور آدمی بھی میرے تانگے میں بیٹھا تھا۔''

یہ میرے لیے ایک انکشاف تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور غنی کوچوان سے پوچھا۔ ''وہ دوسرا آدمی انوار کا ساتھی تھا یا اس سے الگ۔''

''میرا خیال ہے، وہ انوار کا ساتھی نہیں تھا لیکن.....!''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''لیکن کیا عبدالغنی؟''

''جناب! میں اس آدمی کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کر سکتا۔'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''کیوں!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم اس بندے کے بارے میں کوئی حتمی بات کیوں نہیں کر سکتے؟''

''وہ جناب..... پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ وہ انوار کے ساتھ نہیں۔'' عبدالغنی وضاحت

کرتے ہوئے بولا۔''لیکن پپلی والا پہنچنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں.....''

''تو کیا وہ بندہ بھی پپلی والا تک انوار کے ساتھ گیا تھا؟'' میں نے سنسنی خیز انداز میں سوال کیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک مرتبہ پھر تفصیلات کے بحرِ بے کراں میں غوطے لگانے لگا۔ میں خود پر جبر کر کے خاموش بیٹھا اس کی تقریر سنتا رہا کیونکہ بہر حال، وہ دس باتوں میں ایک نہایت ہی اہم اور کانٹے کی بات مجھ تک پہنچا رہا تھا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے مدبرانہ انداز میں بولا۔

''پہلے تو جناب ان کے بیٹھنے کا ہی مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ پچھلی سیٹ تین عورتوں سے فل تھی اور اگلی سیٹ پر بوڑھی اماں بیٹھی ہوئی تھی۔ انوار ہچکچایا اور اس نے مجھ سے کہا کہ میں جاؤں۔ وہ کسی دوسرے تانگے میں آ جائے گا لیکن بوڑھی اماں نے یہ کہتے ہوئے زبردستی اسے تانگے پر اپنے ساتھ بٹھالیا.....تم تو میرے پتروں اور پوتوں کی طرح ہو، شرماؤ نہیں.....انوار تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھا تو اس کی دیکھا دیکھی وہ بندہ بھی اچک کر اوپر آ گیا اور انوار کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا۔ میں نے فوراً تانگا آگے بڑھا دیا.....'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تو جناب.....میں نے ان چاروں بی بیوں کو پھاٹک کی دوسری طرف کنہیالال باغ کے پاس اتار دیا۔ تانگا رکا تو وہ بندہ پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ انوار اگلی سیٹ پر ہی بیٹھا رہا۔ اس طرح ہم لوگ پپلی والا پہنچ گئے۔ وہ دونوں پپلی والا اترے اور میں اپنے گھر ہندو چک چلا گیا.....''

''عبدالغنی!'' وہ خاموش ہوا تو میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔''پہلے تمہیں ایسا لگا تھا کہ انوار اور وہ بندہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں لیکن پپلی والا پہنچ کر ایسی کیا بات ہوئی تھی کہ تمہیں محسوس ہوا، وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں؟''

''جناب! وہ دونوں پورے راستے خاموش اور ایک دوسرے سے لاتعلق بیٹھے رہے تھے۔'' غنی کو چوان نے حیرت بھرے لہجے میں بتایا۔''لیکن جب میں نے انہیں پپلی والا اتارا تو وہ ایک ساتھ چلنے لگے تھے اور اس بندے نے باقاعدہ انوار کے ساتھ بات چیت بھی شروع کر دی

تھی۔ میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور تانگا آگے بڑھا دیا۔''

''ہوں.....'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر عبدالغنی سے پوچھا۔''تم تو انوار کو اچھی طرح جانتے تھے نا؟''

''جی ہاں.....بالکل جانتا تھا۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔''مجھے انوار کی موت کا بڑا گہرا صدمہ ہے جناب۔ وہ بڑا بی بابندہ تھا جی.....!'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس سے پوچھا۔''عبدالغنی! کیا تم نے انوار کے ہاتھ میں گہرے نیلے رنگ کا کوئی سفری بیگ دیکھا تھا؟''

''نہیں جناب.....!'' وہ پورے وثوق سے بولا۔''وہ خالی ہاتھ تھا۔''

''اور دوسرا بندہ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس کے پاس بھی سامان نام کی کوئی شے نہیں تھی۔''

''اس بندے کے حلیے کے بارے میں بتاؤ؟''

غنی کوچوان نے مذکورہ بندے کا حلیہ بیان کر دیا جس میں نمایاں شے اس کے سر کے گھنگھریالے بال تھے۔ میں نے غنی سے پوچھا۔

''تمہارے لیے تو وہ شخص بالکل اجنبی تھا نا؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔''اگر وہ بندہ دوبارہ تمہاری نظر سے گزرے تو تم اسے پہچان لو گے؟''

وہ چند لمحات تک مجھے متذبذب دکھائی دیا پھر بولا۔''جناب! میں نے اس بندے کو رات کے اندھیرے میں دیکھا تھا اس لیے پورے یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے امید ہے کہ میں اس کے گھنگریالے بالوں کی وجہ سے پہچان لوں گا۔''

''یہ تو تمہیں یقین ہے نا، وہ بندہ ہندو چک کا رہنے والا نہیں؟'' میں نے اتمام حجت کے طور پر پوچھ لیا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔'' وہ پُر وثوق لہجے میں بولا۔''میں ہندو چک کے ایک ایک بندے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''

میں نے طفیل کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔''اور پپلی والا کے حوالے سے تمہارا کیا

خیال ہے۔غنی نے اس بندے کا جو قد کاٹھ اور حلیہ بتایا ہے کیا ایسا کوئی شخص پپلی والا میں رہتا ہے؟''

چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔''نہیں جناب!''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ باہر کا بندہ ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔''وہ شیخوپورہ موڑ سے انوار کے ساتھ پپلی والا پہنچا تھا اور پھر انوار کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا.....اس آدمی تک پہنچنا بہت ضروری ہے تاکہ انوار کے قتل کا معما حل کیا جا سکے۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر گہری سنجیدگی سے دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم اپنی آنکھیں کھلی رکھ کر گھومنا اور یادداشت میں اس بندے کے حلیے کو بھی نقش کر لو۔میں بھی اپنے طور پر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔وہ بندہ جلد از جلد مجھے چاہیے.....!''

''ٹھیک ہے جناب۔'' وہ بیک زبان ہو کر بولے۔''ہم آپ کی ہدایت پر پوری طرح عمل کریں گے۔''

''اور اگر تم لوگوں کو کوئی اور اہم بات پتا چلے تو پہلی فرصت میں مجھے بتانا۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔

انہوں نے میرا حکم بجالانے کا وعدہ کیا تو میں نے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔

وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے تو میں نے طفیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''طفیل! تم گھر جا کر اپنے بھائی صدیق کو تسلی دلاسا دینا۔میں کل کسی وقت پپلی والا کا چکر لگاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے جناب! میں بھائی صدیق کو سنبھالنے کی کوشش کروں گا۔'' وہ تعاون آمیز انداز میں بولا۔

انہیں رخصت کرنے کے بعد میں نے کانسٹیبل علی مراد کو اپنے پاس بلایا اور اسے پُراسرار گھنگریالے بالوں والے بندے کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔

''علی نواز! تم اسی علاقے کے رہنے والے ہو۔وہ بندہ شیخوپورہ موڑ سے تانگے پر سوار ہوا تھا۔میں نے اس کا حلیہ تمہیں ذہن نشین کرا دیا ہے۔اسے ڈھونڈ نکالنا اب تمہاری ذمے داری ہے۔''

''میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا ملک صاحب!'' وہ یقین دہانی کرانے

والے انداز میں بولا۔ ''آگے اللہ کی مرضی۔''

''اللہ کی مرضی کے آگے تو کچھ بھی نہیں ہوتا علی نواز!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور میں اللہ کی رضا کو بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے، تم مطلوبہ بندے کو تلاش کرنے میں ضرور کامیاب ہو گے۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے ملک صاحب!'' وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔

''آمین.....!'' میں نے صدقِ دل سے کہا۔

✠ ✠ ✠

رات کو سونے سے پہلے میں لباس ضرور تبدیل کر لیا کرتا تھا۔ یہ لباس عام لباس سے ذرا مختلف ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں میری ایک پختہ عادت یہ بھی رہی ہے کہ اپنے کوارٹر میں آنے کے بعد جب میں یونیفارم اتار کر گھر کے کپڑے پہنتا تھا تو یونیفارم کی تمام جیبیں اچھی طرح چیک کر لیا کرتا تھا۔ اس روز رات کو جب میں نے یہی عمل دہرایا تو ایک شے کی برآمد پر میں چونک اٹھا۔ وہ ڈاک کا ایک لفافہ تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھے یاد آ گیا کہ وہ لفافہ مجھے مقتول کی جامہ تلاشی کے دوران میں ہاتھ لگا تھا اور میں نے چپ چاپ اسے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ ذہن میں یہی تھا کہ مشیر نامہ تیار کرنے (موقع کی کارروائی) کے بعد میں اس لفافے کو کھول کر پڑھوں گا لیکن پھر وہ میرے دھیان سے نکل گیا اور اب.....وہ اچانک میرے سامنے آ گیا تھا۔

لفافے کی پیشانی پر انوار کا نام اور سیالکوٹ کی ایک فیکٹری کا پتا درج تھا۔ یہ کھیلوں کا سامان بنانے والا وہی کارخانہ تھا جہاں میری معلومات کے مطابق انوار نوکری کرتا تھا۔ میں نے کھلے ہوئے لفافے کو کھول کر اندر جھانکا۔ اندر مجھے تہ شدہ ایک کاغذ نظر آیا۔ یہ بچوں کی کسی کاپی سے پھاڑا ہوا صفحہ تھا۔ میں نے اس چوپرت کاغذ کو کھول کر پڑھا۔ یہ دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہوئی کہ اس کاغذ پر صرف ایک سطر تحریر تھی۔ میں نے اس سطر کو پڑھا، لکھا تھا.....

''میں پھگن کے پہلے ہفتے میں رہنے آؤں گی.....تمہاری (ر).....''

یہ ایک سطری تحریر کسی (ر) نے انوار کے لیے لکھی تھی اور جملے کی تعمیر سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ (رے) کوئی لڑکی ہے، مثلاً رفیقہ، رضوانہ، رشیدہ.....وغیرہ۔ میں نے اس مختصر سی تحریر کو کئی

بار پڑھا اور یہی بات سمجھ میں آئی کہ کوئی لڑکی (ر) انوار کی محبت میں مبتلا تھی جب ہی اس نے ''تمہاری ر'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ (ر) نے اس خط کے ذریعے انوار کو اطلاع دی تھی کہ وہ پھگن (پھاگن.....ایک دیسی مہینے کا نام) کے پہلے ہفتے میں رہنے آ رہی ہے۔ کہاں؟.....اس حوالے سے کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ اگر انوار یہ خط پڑھ کر سیالکوٹ سے پپلی والا پہنچا تھا تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ ''ر'' پپلی والا میں رہنے آ رہی تھی۔ کہانی میں لڑکی کے وجود کی آمد کے ساتھ ہی سنسنی خیزی اور دلچسپی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اگر میں اس (ر) تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو انوار کے بہیمانہ قتل کا معما بہ آسانی حل کیا جا سکتا تھا اور اس (ر) کے حوالے سے مجھے دو جگہ سے معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ نمبر ایک، انوار کے گھر سے یعنی صدیق، اس کی بیوی اللہ رکھی اور چھوٹی بہن کوثر سے۔ نمبر دو، سیالکوٹ میں موجود انوار کے روم میٹ صفدر سے۔ اس قسم کے عشقیہ معاملات روم میٹ سے شیئر کرنے کا ایک اپنا ہی مزہ ہے۔ مجھے یقین تھا، صفدر انوار کی (ر) کے بارے میں ضرور کچھ جانتا ہوگا۔

میں نے کاغذ کو تہ کر کے لفافے کے اندر رکھا اور ڈاک خانے کی مہروں وغیرہ کا جائزہ لینے لگا۔ ہر خط پر محکمہ ڈاک کی جانب سے عموماً دو مہریں ثبت کی جاتی ہیں۔ ایک اس پوسٹ آفس کی جہاں سے وہ خط چلتا ہے اور ایک اس ڈاک خانے کی جہاں مذکورہ خط کو پہنچنا ہوتا ہے۔ یہ مہریں باقاعدہ تاریخ کے ساتھ لگائی جاتی ہیں۔ لفافے کے جائزے کے بعد میں یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ خط دس فروری کو گوجرانوالہ کے ایک پوسٹ آفس سے روانہ ہوا تھا اور بارہ فروری کو سیالکوٹ کے ایک ڈاک خانے میں وصول کیا گیا تھا اور آج.....چودہ فروری تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ انوار (ر) کا خط پڑھتے ہی بے قرار ہو گیا تھا اور اس سے ملنے کے لیے وہ سیالکوٹ سے پپلی والا پہنچ گیا تھا۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ مذکورہ خط تیرہ فروری کو انوار کے ہاتھ لگا ہوگا۔ خط ملنے کے دوسرے ہی دن اس کا پپلی والا پہنچ جانا اس امر کا ثبوت تھا کہ وہ (ر) سے ملنے کے لیے بے حد بے چین تھا لیکن افسوس کہ.....پپلی والا میں قدم رکھتے ہی اسے موت نے نگل لیا تھا۔

اس تناظر میں، میں بڑے وثوق سے یہ کہہ سکتا تھا کہ انوار کا قتل لوٹ مار کی نہیں بلکہ حسد اور انتقام کی ایک سنگین واردات تھی۔

میں گہری سنجیدگی سے اس معاملے پر غور کرنے لگا۔ (ر) نے ''رہنے آؤں گی'' کے الفاظ استعمال کیے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پپلی والا کی رہنے والی نہیں بلکہ کسی دوسرے علاقے سے وہاں رہنے آنے والی تھی۔ پھگن (پھاگن) کا مہینا بارہ فروری سے شروع ہو جاتا ہے اور اس کا اختتام تیرہ مارچ پر ہوتا ہے۔ اس حساب سے آج پھاگن کی تین تاریخ تھی۔ (ر) نے پھاگن کے پہلے ہفتے میں آنے کی بابت تحریر کیا تھا یعنی بارہ سے اٹھارہ فروری کے درمیان۔ ان حقائق کی روشنی میں بڑے وثوق سے کہا جا سکتا تھا کہ اس وقت وہ (ر) پپلی والا میں موجود ہو گی.....!

اس سوچ کے ساتھ ہی مجھے اپنے وجود میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اگر میں اس (ر) تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر انوار کے قاتل کی گردن میری مضبوط گرفت میں ہوتی۔ میں نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں فیصلہ کر لیا کہ مجھے ابھی اور اسی وقت پپلی والا جانا چاہیے.....!

اس وقت رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میں نے یونیفارم دوبارہ اپنے بدن پر سجایا اور کوارٹر کا دروازہ بند کر کے تھانے میں آ گیا۔ شبینہ ڈیوٹی پر مامور اے ایس آئی منظور احمد مجھے دیکھتے ہی چونک اٹھا، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''ملک صاحب! خیریت تو ہے.....؟''

''خیریت نہیں ہے منظور!'' میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

''آپ اس وقت یونیفارم میں۔'' وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا کسی خاص مشن پر روانہ ہونے کا ارادہ ہے؟''

''خاص الخاص مشن ہے.....!'' میں نے مختصراً بتایا پھر کہا۔ ''منظور! میرے لیے فوراً کسی سواری کا بندوبست کرو۔ مجھے ابھی اور اسی وقت پپلی والا جانا ہے۔''

''سواری.....سواری۔'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''جناب! اس وقت کوئی تانگا وغیرہ ملنا تو ممکن نظر نہیں آ رہا لیکن پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں.....''

''ہاں جاؤ.....اور یہ کوشش شروع کر دو۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''میں یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''وہ کوشش کرنے'' کے لیے روانہ ہوگیا۔

انسان کا ذہن بڑی عجیب وغریب ''شے'' ہے۔اس میں بہ یک وقت ''ہاں'' اور ''نہ'' کی سوچیں پیدہوتی رہتی ہیں۔انسان مسلسل ''تائید'' اور ''تردید'' کی کیفیت سے گزرتا رہتا ہے۔ ان لمحات میں میرا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ایک طرف ذہن یہ کہہ رہا تھا کہ اس وقت پپلی والا جانے کی کیا ضرورت ہے۔اس معاملے کو صبح بھی دیکھا جاسکتا ہے۔اگر (ر) واقعی وہاں رہنے آچکی ہے تو وہ صبح تک کہیں فرار نہیں ہوجائے گی۔اس کے بارے میں کل بھی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

دوسری جانب ذہن اس سوچ کی تردید کچھ اس انداز میں کررہا تھا.....آج کے کام کو کل پر ٹالنا کوئی دانش مندی نہیں۔اس میں نقصان بھی ہوسکتا ہے لہٰذا جو معاملہ ابھی نمٹ جائے وہی اچھا ہے۔مجھے پپلی والا ضرور جانا چاہیے.....ابھی اور اسی وقت!

فرض کا تقاضا بھی یہی تھا کہ میں اپنی نیند اور آرام کو قربان کرکے فوراً پپلی والا روانہ ہو جاؤں۔ادھر میں نے پپلی والا جانے کے فیصلے کے حق میں ووٹ دیا، ادھر اے ایس آئی واپس آ گیا۔میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

''ملک صاحب! میں نے آپ کے لیے سواری کا بندوبست کردیا ہے.....!''

''کیا کوئی تانگا ہاتھ لگا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تانگا نہیں جناب، ایک اسکوٹر والا ہے۔'' اے ایس آئی منظور نے جواب دیا۔

میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔''اسکوٹر والا؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''یہ بندہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک پیٹرول پمپ پر کام کرتا ہے ادھر کنگنی والا میں اس کی رہائش ہے۔یہ اپنی ڈیوٹی پر جا رہا تھا کہ میں نے ہاتھ دے کر روک لیا۔اب یہ پہلے آپ کو پپلی والا پہنچائے گا اور اس کے بعد پیٹرول پمپ کا رخ کرے گا۔''

میں اے ایس آئی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے تھانے کے احاطے میں نکل آیا۔پھر اسکوٹر والے سے میری ملاقات ہوگئی۔اس کے پاس ایک پھٹیچر سا ویسپا اسکوٹر تھا۔جس نے اپنا نام امان اللہ بتایا تھا۔امان اللہ کی عمر پینتالیس سال کے قریب رہی ہوگی۔وہ ایک صحت مند، موٹا تازہ اور گینڈا نما شخص تھا۔رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''امان اللہ! اے ایس آئی نے تمہیں کام کے بارے میں تو بتا دیا ہے نا؟''

''جی تھانے دار صاحب!'' وہ بڑے احترام کے ساتھ بولا۔ ''مجھے آپ کو پپلی والا پہنچانا ہے۔''

''ہاں، کام تو یہی ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا پھر سوال کیا۔ ''کیا تم اس وقت ڈیوٹی پر جا رہے تھے؟''

''جی ہاں، رات میں پورے پیٹرول پمپ کو میں ہی سنبھالتا ہوں۔'' اس نے جواب میں بتایا۔ ''پیٹرول پمپ کا مالک مجھ پر اندھا اعتماد کرتا ہے۔ یہ اسکوٹر بھی اسی نے مجھے دے رکھا ہے۔''

''بڑی اچھی بات ہے۔'' میں نے تعریفی نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''تمہاری ڈیوٹی کتنے بجے شروع ہوتی ہے؟''

''رات کو دس بجے جناب۔'' اس نے بتایا پھر اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالنے کے بعد بولا۔ ''دس بجنے میں ابھی پچیس منٹ باقی ہیں۔ میرا خیال ہے، میں آپ کو پپلی والا چھوڑنے کے بعد بہ آسانی اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جاؤں گا۔ اگر پانچ دس منٹ لیٹ بھی ہو گیا تو کوئی بات نہیں۔ میں جب تک پیٹرول پمپ نہیں پہنچوں گا، دن کی ڈیوٹی والا بندہ جائے گا نہیں۔''

امان اللہ کی اطمینان بخش وضاحت سننے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا خیال ہے، تو پھر چلیں؟''

''بالکل چلیں جناب!'' وہ اپنے ویسپا کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

امان اللہ نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور ہم دونوں اس شیطانی چرخے پر سوار ہو کر پپلی والا کی جانب روانہ ہو گئے۔ تھانے سے نکلتے وقت میں نے اے ایس آئی منظور احمد کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ میری غیر موجودی میں وہ چوکس اور ہوشیار رہے۔ اس نے میرے حکم پر عمل کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ منظور احمد بہت ہی محنتی اور سمجھ دار شخص تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ آگے چل کر بہت ترقی کرے گا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں اس وقت بھی اور آج بھی ایسے فرض شناس اور بہادر لوگوں کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہی ہے۔

امان اللہ نے مجھے صدیق پرچون والے کے گھر کے سامنے ''ڈراپ'' کیا تو میں نے

اسے دعا دی۔ ''اللہ تمہارے نام کی لاج رکھے.....!''

''جی.....'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں جناب؟''

میں نے فوراً وضاحت کر دی۔ ''دیکھو! تمہارا نام ''امان اللہ'' ہے.....یعنی ایسا شخص جو اللہ کی امان وسلامتی میں ہو۔ قدرت یونہی تمہاری حفاظت کرتی رہے۔''

''اس دعا کا بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ مجھے دوسرے پولیس والوں سے بہت مختلف لگے ہیں اس لیے میں آپ سے ایک سوال کرنے کی ہمت کر رہا ہوں.....؟''

''ہاں، ہاں.....ضرور!'' اس کی سوالیہ نظر کے جواب میں، میں نے کہا۔ ''ایک نہیں، تم دس سوال پوچھ سکتے ہو.....!''

''دس نہیں، صرف ایک جناب!'' وہ دوٹوک انداز میں بولا پھر اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کی دعا اور میرے نام کی لاج رکھتے ہوئے اللہ مجھے تو اپنی حفظ وامان میں رکھے گا لیکن کوئی ایسا فارمولا یا وظیفہ بھی ہے کہ ہمارا پیٹرول پمپ کسی کی زیادتی کا نشانہ بننے سے محفوظ رہے.....؟''

''آخر تمہارے پیٹرول پمپ کے ساتھ ایسا کیا ہو گیا ہے؟'' میں نے تشویش ناک نظر سے امان اللہ کی طرف دیکھا۔ اس کے پیچیدہ سوال نے مجھے گڑبڑا کر رکھ دیا تھا۔

''جناب! چند لوگوں نے ہمیں بہت پریشان کر رکھا ہے۔'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

''کون ہیں وہ کم بخت.....؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ آپ ہی کے پٹی بھائی ہیں جناب.....!'' اس نے دکھی لہجے میں بتایا۔

''اوہ.....!'' میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

''اب یہ وضاحت سے بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ ان لوگوں نے ہمیں کس طریقے سے تنگ کر رکھا ہے!'' امان اللہ نے شاکی لہجے میں کہا۔ ''ماشاءاللہ! آپ سمجھ دار ہیں۔ فوراً سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا اشارہ کس مسئلے کی جانب ہے؟''

''لگتا ہے، تم ''پیداگیری'' وغیرہ کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جناب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہم بھتا دے دے کر تنگ آ چکے ہیں۔''

جس ڈیپارٹمنٹ کی سربلندی کے لیے میں رات دن کوشاں رہتا تھا، جب اس کے بارے میں کوئی ایسی خبر سننے کو ملتی تھی تو میرا سر شرم سے جھک جاتا تھا لیکن سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ اس شرمندگی سے وہ ''حقیقت'' نہیں بدل پاتی جس کی نشان دہی امان اللہ کر رہا تھا!

''امان اللہ!'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''تم جس پیٹرول پمپ پر سپروائزر ہو وہ اگرچہ میرے تھانے کی حدود میں نہیں آتا لیکن پھر بھی میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی نہ کسی طرح تمہارا یہ مسئلہ ضرور حل کروادوں گا۔''

''یہ تو آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا جناب!'' وہ تشکر آمیز انداز میں بولا۔

پھر وہ مجھ سے پُرجوش مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

میں دو قدم آگے بڑھا اور صدیق کی دہلیز پر پہنچ کر دستک دینے لگا۔

امان اللہ کے کردار اور گفتار نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ یہ اس کا ایک نیک اور قابلِ قدر عمل تھا کہ وہ اپنے ویسپا پر مجھے پیلی والا تک چھوڑنے آ گیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف ایک امن پسند اور شریف شہری ہے بلکہ قانون کا احترام کرنا بھی جانتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے کردار کا سب سے زیادہ لائقِ تحسین پہلو یہ تھا کہ اسے اس پیٹرول پمپ کے معاملات کی بڑی فکر تھی جہاں پر وہ ملازم تھا۔ وہ پیٹرول پمپ اس کی ملکیت نہیں تھا لیکن وہ اسے اپنا سمجھتے ہوئے اس کے لیے پریشان تھا۔ ایسے مخلص، محنتی اور اپنے مالک سے وفادار ملازم بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہ امان اللہ کے کردار کی سربلندی ہی تھی کہ پیٹرول پمپ کا مالک اس پر اندھا اعتماد کرتا تھا اور آمدورفت کے لیے اسے ایک اسکوٹر بھی دے رکھا تھا۔ ان لمحات میں اس کے لیے میرے دل سے ایک مرتبہ پھر دعا نکلی۔

''اے اللہ! تُو اس امان اللہ کو اپنی امان میں رکھنا!''

✠ ✠ ✠

دستک کے جواب میں دروازہ محمد طفیل نے کھولا تھا۔اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ابھی تک میت والے گھر ہی میں موجود تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک اٹھا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''تھانے دار صاحب! آپ اس وقت.....؟''

''ہاں، ایک اہم بات یاد آ گئی تھی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''سوچا، آپ لوگوں سے اس کی تصدیق کرلوں تا کہ انوار کے قتل کے معمے کو جلد از جلد حل کیا جا سکے!''

''آئیں جی، آپ اندر آ جائیں۔'' وہ میرے لیے دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

میں مقتول کے گھر میں داخل ہو گیا۔

ایک منٹ کے بعد میں بیٹھک میں صدیق، طفیل اور اللہ رکھی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ صدیق کی بیوی اللہ رکھی پہلی مرتبہ میرے سامنے آئی تھی۔ وہ ایک گوری چٹی اور موٹی تازی عورت تھی۔ اللہ رکھی کی عمر پچاس کے قریب رہی ہوگی۔ اس نے ٹاسے (لیلن) کی سفید چادر میں خود کو اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ صرف اس کے ہاتھ اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ تینوں بڑی متفکر اور گمبھیر نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ لالٹین کی مدھم روشنی نے بیٹھک کے ماحول کو بڑا پُر اسرار اور سنسنی خیز بنا رکھا تھا۔

اس ہیبت ناک اور سناٹے دار خاموشی کو میں نے ہی توڑا۔ میں نے باری باری ان تینوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر غیر ارادی طور پر میری نگاہ اللہ رکھی پر آ کر ٹک گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے، وہاں موجود تمام لوگوں سے ایک مشترکہ سوال کیا۔

''مجھے انوار کے ایک بہت ہی خاص معاملے کا پتا چلا ہے۔ اگر آپ میں سے کوئی اس معاملے کی تفصیل بتا دے تو میں بڑی آسانی سے انوار کے قاتل تک رسائی حاصل کر سکتا ہوں.....!''

''کیسا معاملہ تھانے دار جی؟'' سب سے پہلے اللہ رکھی نے مجھ سے سوال کیا۔

اسی سے ملتے جلتے استفسارات طفیل اور صدیق نے بھی کیے۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ انوار کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا.....!''

''جی.....!'' طفیل نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔''انوار اور محبت..... مجھے تو یقین نہیں آ رہا، یہ آپ نے کہاں سے سن لیا جناب؟''

صدیق نے سپاٹ آواز میں کہا۔''تھانے دار جی! میرا انوار تو بہت ہی شرمیلا اور بزدل قسم کا لڑکا تھا۔ یہ کام اس کے بس کا کہاں تھا۔ میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر الجھن زدہ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ اتنے وثوق سے یہ بات کہہ رہے ہیں تو اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔ آپ ذرا کھل کر بتائیں مجھے؟''

میں نے صدیق کی فرمائش کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اللہ رکھی کی جانب دیکھا پھر کہا۔ ''کسی انسان کا شریف، شرمیلا اور بزدل ہونا ایک الگ بات ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان خصوصیات کا حامل شخص عشق اور محبت نہ کر سکتا ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے اللہ رکھی.....؟''

''آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے.....تھانے دار جی.....!'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولی۔''پر یہ تو بتائیں کہ لڑکی کا کیا چکر ہے۔ لگتا ہے، آپ کے ذہن میں اس لڑکی کے بارے میں پوری معلومات ہیں!''

میں نے محسوس کیا کہ طفیل اور صدیق کی بہ نسبت اللہ رکھی اس معاملے میں گہری دلچسپی لے رہی تھی۔ میں نے اسی کو گھسنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اس بات کا مجھے بہ خوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دونوں بھائی اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ وہ لڑکی کا ذکر سنتے ہی خال الذہن اور فارغ الزبان ہو گئے تھے۔

''اللہ رکھی.....!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''اس لڑکی کا نام (ر) سے شروع ہوتا ہے۔''

''(ر) سے.....؟'' وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

''اور.....وہ پپلی والا کی رہنے والی بھی نہیں.....!'' میں نے نفسیاتی ٹیک جاری رکھا۔

اللہ رکھی پریشان نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

میں نے بہ دستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''وہ پچھلے دو دن سے یہاں پپلی والا میں رہنے آئی ہوئی ہے۔ انوار اسی لڑکی سے ملنے آیا تھا اور.....!''

''تھانے دار صاحب!'' صدیق نے بے حد الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔''آپ یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔ آپ سیدھا سیدھا اس لڑکی کا نام کیوں نہیں بتاتے؟''

''اگر مجھے اس کا نام پتا ہوتا تو میں آپ لوگوں کو ضرور بتا دیتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

اللہ رکھی نے پوچھا۔''تھانے دار جی! اگر آپ اس لڑکی کو نہیں جانتے تو پھر آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ اس کا نام (ر) سے آتا ہے؟''

''اللہ رکھی! اللہ تمہارا بھلا کرے.....!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اضافہ کیا۔''مجھے اس لڑکی کے نام اور پہلی والا میں آمد کے بارے میں اس خط سے معلوم ہوا ہے.....!''

ان تینوں نے متاملانہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ان کی سوالیہ نگاہیں میرے چہرے پر آ کر ٹھہر گئیں اور وہ بہ یک زبان ہو کر بولے۔

''خط.....؟''

''یہ خط مجھے انوار کی جامہ تلاشی کے دوران میں، اس کی ایک جیب میں سے ملا تھا۔'' میں نے مذکورہ خط انہیں دکھاتے ہوئے وضاحت کی۔''یہ خط دس فروری کو گوجرانوالہ سے سیالکوٹ بھیجا گیا تھا اور بارہ یا تیرہ فروری کو یہ خط انوار کو ملا تھا۔ وہ اس خط کو پڑھ کر ہی یہاں آیا تھا.....اپنی محبوبہ (ر) سے ملنے!''

''اس خط کے اندر لکھا کیا ہے؟'' اللہ رکھی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

میں نے مذکورہ خط محمد طفیل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔''لو.....تم یہ خط پڑھ کر اپنی بھابی اللہ رکھی کو سناؤ۔''

وہ خط کو میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے معذور لہجے میں بولا۔''جناب! مجھے تو لکھنا پڑھنا بالکل نہیں آتا!''

''تو پھر تم یہ خط اپنے بھائی صدیق کو پڑھنے کے لیے دو.....!''

خط تھامنے سے پہلے ہی صدیق ''ہینڈز اپ'' ہو گیا۔ مسکین سی صورت بناتے ہوئے اس

نے کہا۔ ''جناب! میں بھی اَن پڑھ ہوں۔ یہ کام میرے بس کا نہیں۔''

''اچھا.....'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کمال ہے صدیق.....تم تو پرچون کی دکان چلاتے ہو۔ لوگ تم سے ادھار سودا بھی لیتے ہوں گے۔ وہ حساب کس طرح لکھتے ہو؟''

''یہ آپ نے بالکل صحیح کہا ہے جی کہ لوگ ادھار سودا بھی لیتے ہوں گے۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''ادھار کے بغیر تو کریانہ کی دکان چل ہی نہیں سکتی۔ میں ایسا کرتا ہوں جناب.....'' ایک لمحے کو رک کر اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جو بھی عورت اور مرد مجھ سے ادھار سودا لیتا ہے، میں اس کا نام، سودا اور سودے کی قیمت اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہوں پھر، جب کوئی اسکول کا بچہ ادھر سے گزرتا ہے تو میں بتا کر اس سے کاپی میں لکھوا لیتا ہوں، میرے پڑوس میں ایک اسکول ماسٹر بھی رہتا ہے۔ میں مہینے کے آخر میں، ماسٹر جمیل سے لوگوں کے ادھار کا تخمینہ لگوا لیتا ہوں۔ اس طرح میرا کام چلتا رہتا ہے۔''

''واہ بھئی وا.....'' میں نے ستائشی نظر سے صدیق کی طرف دیکھا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تمہارا حافظہ بہت اچھا ہے۔ تم اپنی یادداشت کے سہارے یہ کھیل کھیلتے ہو!''

''بس جی، گزارہ چل جاتا ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔

اللہ رکھی مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار جی! یہاں کوئی پڑھا لکھا موجود نہیں۔ آپ ہی اس خط کو پڑھ کر سنا دیں۔ ذرا پتا تو چلے وہ (ر) کون نامراد ہے جس کی وجہ سے میرا جوان جہان بیٹا موت کے منہ میں چلا گیا؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اللہ رکھی کی خواہش پوری کر دی۔

''یہ کیا بات ہوئی جی.....؟'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میں پھگن کے پہلے ہفتے میں رہنے آؤں گی.....تمہاری (ر).....!''

''یہی تو بات ہے اللہ رکھی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اسی لڑکی (ر) تک پہنچنا ہے جو یہاں پیلی والا میں رہنے آئی ہوئی ہے یا پھر آج کل میں آنے ہی والی ہے۔ پھگن کا مہینا شروع ہو چکا ہے۔ آج پھگن کی تین تاریخ ہے۔ اس ہفتے کے چار دن باقی ہیں۔ انوار اسی (ر) سے ملنے سیالکوٹ سے یہاں آیا تھا۔ ''تمہاری (ر)'' سے صاف پتا چلتا ہے کہ انوار اور وہ لڑکی ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں.....'' میں نے سانس ہموار کرنے کے

لیے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''خط کو دیکھ کر یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان دونوں میں پہلے بھی اس نوعیت کی خط کتابت ہوتی رہی ہے اور زیادہ امکانات اس بات کے ہیں کہ انوار، اس لڑکی کے بلانے پر ہی پپلی والا آیا کرتا تھا کبھی ڈیڑھ ماہ کے بعد اور کبھی دو، ڈھائی ماہ کے بعد.....''

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں تھانے دار صاحب!'' صدیق نے دزدیدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''انوار ہمارا بیٹا تھا۔ ہم اس کے ماں باپ ہیں، پھر اس گھر میں اس کی چھوٹی بہن کوثر بھی رہتی ہے، وہ ہم لوگوں سے ملنے آئے گا یا کسی لڑکی سے ملاقات کرنے؟''

''تم نے جو حقائق بیان کیے ہیں ان سے انکار ممکن نہیں صدیق!'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں تمہاری تائید کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ انوار اس نامعلوم لڑکی کے بلانے پر ہی پپلی والا آیا تھا۔''

''اس خط میں آگے بھی تو کچھ لکھا ہوگا۔'' اللہ رکھی نے کہا۔ ''وہ بھی تو پڑھ کر سنائیں تھانے دار جی..... ہوسکتا ہے، اس بدبخت کے بارے میں کوئی اشارہ مل جائے!''

''نہ کچھ آگے اور نہ ہی کچھ پیچھے.....'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس خط میں بس یہی ایک جملہ لکھا ہوا ہے۔''

''آپ نے تو ہمیں ایک نئی الجھن میں ڈال دیا ہے جناب!'' طفیل نے متوحش انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''دیکھو! تم لوگ الجھنے یا پریشان ہونے کے بجائے اپنے ذہنوں کو قابو میں رکھو اور اچھی طرح سوچ کر مجھے بتاؤ کہ پپلی والا میں کس کے گھر کون لڑکی رہنے آئی ہوئی ہے۔ یہ کوئی بہت بڑا گاؤں نہیں۔ اگر تم لوگ کوشش کرو گے تو میرا خیال ہے، ایک گھنٹے کے اندر یہ پتا چلانے میں کامیاب ہو جاؤ گے کہ (ر) نامی وہ لڑکی کون ہے جس کا پپلی والا میں گھر نہیں ہے اور وہ کہیں اور سے آ کر یہاں ٹھہری ہوئی ہے یا آنے والی ہے.....؟''

''جہاں تک میرا دماغ کام کرتا ہے.....'' اللہ رکھی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس وقت پپلی والا میں باہر سے کوئی لڑکی نہیں آئی ہوئی..... ویسے میں صبح اور تحقیق کروں گی۔ اس وقت گھر گھر جا کر دروازے کھٹکھٹانا ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''اللہ رکھی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے جناب!'' صدیق نے کہا۔''ایک تو ہمارے گھر میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے اوپر سے.....!''

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں صدیق!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''میں بھی کل صبح ہی ''کوشش'' کرنے کے بارے میں کہہ رہا ہوں.....ویسے یہ گھر گھر جا کر دروازے کھٹکھٹانے کا کام میں اس وقت بھی کر سکتا ہوں لیکن میں اس لڑکی پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا کہ مجھے اس کے ''راز'' کی خبر ہوگئی۔ اگر وہ محتاط ہوگئی تو ہاتھ سے نکل جائے گی اور میں یہ نہیں چاہوں گا کہ (ر) کے کان کھڑے ہوں.....!'' میں نے لمحاتی توقف کر کے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیا پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ کل صبح، اپنے اپنے طور پر نہایت ہی حتیاط کے ساتھ سا کام میں لگ جاؤ۔ میں کل دوپہر کے بعد پپلی والا کا چکر لگاؤں گا۔ پھر دیکھیں گے، آگے کیا ہو سکتا ہے!''

''جناب! آپ جیسے کہہ رہے ہیں، ہم بالکل ویسے ہی کریں گے۔'' طفیل نے کہا۔

''اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا ہے کہ اس خط کے بارے میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ راز ہم چاروں کے درمیان رہے گا۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''آپ بے فکر ہو جائیں تھانے دار جی۔'' اللہ رکھی نے بڑے اعتماد سے کہا۔''یہ راز ہمارے سینوں میں دفن رہے گا اور مجھے امید ہے کہ جب کل آپ یہاں آئیں گے تو میں یہ کام کر چکی ہوں گی۔ اگر وہ (ر) کی بچی پپلی والا میں موجود ہے تو میری نظر سے بچ نہیں سکے گی.....!''

''ان شاءَ اللہ.....!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ تینوں بھی تقلید میں کھڑے ہو گئے۔ میں نے صدیق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے انوار کے بیگ والا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ طفیل نے تمہیں اس بارے میں تو بتایا ہوگا؟''

''جی ہاں!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''مجھے پتا چل چکا ہے کہ انوار سفری بیگ کے بغیر ہی آیا تھا لیکن جناب.....یہ گھنگریالے بالوں والا بندہ کون ہے؟''

''مجھے لڑکی (ر) کے ساتھ ہی اس گھنگریالے بالوں والے بندے کی بھی تلاش ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ اس بندے کا تعلق پپلی والا یا ہندو

چک سے نہیں۔ بہر حال میں اسے ڈھونڈنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کو بھی اس سلسلے میں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا ہوں گے.....!''

ان تینوں نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور میں صدیق کے گھر سے نکل آیا۔ میرا خیال ہے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ محمد طفیل واپسی میں مجھے اپنے تانگے پر تھانے چھوڑنے آیا تھا۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر اے ایس آئی منظور احمد کو اپنے پاس بلا لیا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

''منظور! تم تھکے ہوئے تو نہیں ہو؟''

''نہیں ملک صاحب!'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ حکم کریں، کیا کرنا ہے؟''

''جو بھی کرنا ہے وہ کل ہی کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''منظور! کل صبح تمہیں چھٹی نہیں ملے گی۔ تم سہ پہر تک تھانے میں موجود رہو گے۔ اس کے بعد تم جا سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے جناب! میں سہ پہر تک رک جاؤں گا۔'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''ملک صاحب! کل کوئی خاص بات ہے؟''

''کل کا آدھا دن تمہیں میری جگہ ڈیوٹی دینا ہوگی۔'' میں نے معنی خیز انداز میں بتایا۔

''اس کا مطلب ہے، آپ کو تھانے سے باہر کہیں جانا ہے!'' اس کی زود حسی نے کام دکھا دیا۔

میں نے کہا۔ ''صرف تھانے ہی سے نہیں بلکہ گوجرانوالہ سے باہر جا رہا ہوں لیکن میں دو پہر تک واپس آ جاؤں گا۔''

''آپ بے فکر ہو کر جائیں جناب! میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''مجھے تم سے یہی امید ہے منظور احمد۔''

''آپ گوجرانوالہ سے باہر کہاں جا رہے ہیں؟''

''سیالکوٹ.....مقتول انوار کے بارے میں تھوڑی تفتیش کرنا ہے۔''

مزید کوئی سوال کرنے کے بجائے منظور نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

✠ ✠ ✠

مقتول انوار سیالکوٹ میں ''ڈرموں والا چوک'' کے نزدیک ایک گلی میں رہائش پذیر ہوا کرتا تھا۔ آج کل وہ اپنے اصلی گھر جا چکا تھا جہاں بے شک، ایک روز ہم سب کو جانا ہے۔ انوار کے ساتھ اس گھر میں وزیر آباد کا رہنے والا صفدر بھی رہ رہا تھا۔ یہ گھر دراصل رشیدہ بی بی نامی ایک بیوہ عورت کا تھا جس نے اپنے گھر کا ایک کمرا ان دونوں کو کرایے پر دے رکھا تھا۔ میں صفدر ہی سے ملاقات کرنے گوجرانوالہ سے سیالکوٹ پہنچا تھا۔ گوجرانوالہ سے سیالکوٹ تک کا راستہ پونے گھنٹے کا ہے۔ میں علی الصباح تھانے سے نکل آیا تھا اور اس وقت سیالکوٹ پہنچ چکا تھا۔ اس وقت میں عوامی لباس میں تھا تاہم اپنے محکمے اور عہدے کی شناخت کے علاوہ سروس ریوالور بھی میرے عوامی لباس کے اندر موجود تھا۔

صفدر سے ملنے کے لیے دو ہی مقامات پر کوشش کی جا سکتی تھی۔ ایک اس کی قیام گاہ پر اور دوسرے اس کارخانے میں جہاں وہ کام کرتا تھا۔ میں نے ڈرموں والا چوک کا رخ کرنے کے بجائے کھیلوں کا سامان تیار کرنے والے کارخانے کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ اگر میں صفدر کو گھر پر پکڑنے کی کوشش کرتا تو اس بات کے امکانات بہرحال تھے کہ وہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے اپنے کارخانے روانہ ہو چکا ہوتا اور مجھے اس کے پیچھے کارخانے تک دوڑ لگانا پڑتی جبکہ کارخانے جانے کا فائدہ یہ تھا کہ صفدر کو بہرحال وہیں آنا تھا، میرے پہنچنے سے پہلے یا اس کے بعد.....!''

میں بس اسٹینڈ سے ایک تانگے پر سوار ہو کر کھیلوں کا سامان بنانے والے مذکورہ کارخانے میں پہنچ گیا۔ کارخانے کے دفتر نما کمرے میں ایک دبلے پتلے اور دراز قامت شخص سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے ہلکی سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ عمر لگ بھگ چالیس سال رہی ہو گی۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں گوجرانوالہ سے آیا ہوں۔ وہاں کے تھانا صدر کا انچارج ہوں میں.....!''

وہ دراز قامت شخص اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے، مجھ

سے مصافحہ کیا پھر ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خوش اخلاقی سے بولا۔ ''آپ یہاں تشریف رکھیں!''

میں نے مذکورہ کرسی پر تشریف رکھ دی۔

وہ بھی دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد کہا۔ ''میرا نام عبدالغفور ہے۔ حکم کریں، کیسے آنا ہوا؟''

اس کے حسن اخلاق نے مجھے متاثر کیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''غفور صاحب! کیا اس کارخانے کے مالک آپ ہی ہیں؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں تو یہاں اکاؤنٹینٹ ہوں۔ آپ منشی وغیرہ سمجھ لیں۔ کارخانے کے مالک بابو رفیق تو ایک ضروری کام سے لاہور گئے ہوئے ہیں۔''

وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''بابو رفیق کی غیر موجودی میں کارخانے کے سارے معاملات میں ہی دیکھتا ہوں۔ آپ بتائیں جناب، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''کام بہت چھوٹا سا لیکن نہایت ہی اہم ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اسی لیے مجھے صبح صبح گوجرانوالہ سے سیالکوٹ آنا پڑا.....!''

اس کے چہرے پر بھی سنجیدگی نمودار ہوگئی، ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''صفدر حیات صاحب! میں آپ کی بات تسلی سے سنتا ہوں، پہلے ذرا آپ کے لیے ناشتے پانی کا بندوبست.....''

''اس تکلف کی ضرورت نہیں عبدالغفور!'' میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا اور کہا۔ ''میں نے ابھی بس اسٹینڈ پر بڑا تگڑا ناشتا کیا ہے۔''

اس نے میری خاطر تواضع کے لیے تھوڑی ضد کی لیکن میرے چٹے انکار کے بعد وہ ''باز'' آ گیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

''جی تھانے دار صاحب! حکم کریں، میں آپ کی کیا خدمت کروں۔''

میں نے کہا۔ ''منشی جی! اس کارخانے میں دو لڑکے کام کرتے ہیں۔ ایک کا نام صفدر اور دوسرے کا نام انوار ہے۔ صفدر وزیر آباد کا رہنے والا ہے اور انوار.....''

''انوار کا تعلق آپ کے شہر گوجرانوالہ سے ہے۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے

ہی بول اٹھا۔ ''وہ وہاں کے ایک گاؤں پپلی والا کا رہنے والا ہے۔ یہ دونوں لڑکے یہاں ڈرموں والا چوک میں کرایے کے ایک مکان میں رہتے ہیں۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے منشی جی!'' میں نے عبدالغفور کو اس کے دیسی عہدے سے مخاطب کیا۔ ''میں انہی دونوں کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں؟''

اس کے کان (محاورتاً) کھڑے ہو گئے، چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''خیریت تو ہے نا جناب..... انوار تو کل ہی یہاں سے گیا ہے۔ آپ گوجرانوالہ سے آئے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انوار کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے.....؟''

''آپ ایک ذہین اور سمجھدار اکاؤنٹینٹ ہیں غفور صاحب!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہ بتائیں کہ انوار کل کتنے بجے یہاں سے گیا ہے؟''

''وہ کل صبح جب کارخانے آیا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' منشی غفور نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''انوار نے کسی خط وغیرہ کا بھی ذکر کیا تھا۔ وہ دو دن کے لیے گھر جانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ دوپہر کے بعد چلے جانا اور وہ چلا گیا۔ بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں جانتا۔''

''انوار نے جس خط کا ذکر کیا تھا.....'' میں غفور منشی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ نے وہ خط پڑھا تھا؟''

''نہیں جناب! میں نے خط پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ انوار بہت ہی شریف اور ایمان دار لڑکا ہے۔ میں نے اس کی زبان پر اعتبار کر کے اسے چھٹی دے دی تھی۔'' منشی نے بتایا پھر تشویش بھرے انداز میں مجھ سے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ آخر معاملہ کیا ہے، میرا دل کہہ رہا ہے کہ انوار کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے.....؟''

''تمہارا دل غلط نہیں کہہ رہا غفور۔'' میں نے کہا۔ ''انوار کے ساتھ بڑی سنگین گڑبڑ ہو چکی ہے۔''

''کک..... کیا جناب.....!'' اس کی آنکھوں سے تفکر جھلکنے لگا۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں عبدالغفور کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور آخر میں ایک افسردہ سی سانس خارج کرنے کے بعد بولا۔ ''یہ تو

بہت برا ہوا جناب..... بہت برا!''

''ہاں برا تو ہوا'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس برے کو اب ایک ہی طریقے سے اچھا کیا جا سکتا ہے!''

''وہ کیسے جناب؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''انوار کے قاتل یا قاتلوں کو گرفتار کرنے کے بعد، عبرت ناک انجام سے دوچار کر کے.....!''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب!'' غفور نے پُرسوچ انداز میں گردن ہلائی۔ ''انوار کو اس دنیا میں واپس لانا تو ممکن نہیں، اگر اس کے قاتلوں کو پکڑ کر قرار واقعی سزا دلوا دی جائے تو اس کے ساتھ انصاف ہو جائے گا۔''

''میں اسی سلسلے میں تو یہاں آیا ہوں.....!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''جی.....!'' منشی غفور سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انوار کے قاتلوں کا تعلق اس کارخانے سے یا سیالکوٹ سے ہے.....؟''

''اس بات کے امکانات کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا لیکن میں نے فی الحال ایسا کچھ نہیں کہا۔'' میں نے فوراً وضاحت کر دی۔ ''لیلیٰ..... یہ ضرور ہے کہ یہاں سے مجھے انوار کی محبت کے بارے میں کافی معلومات مل سکتی ہیں جو اس کے قاتلوں تک رسائی حاصل کرنے میں میری مدد کریں گے.....!''

''اس قسم کی معلومات آپ کس سے لینا چاہیں گے؟'' منشی غفور نے پوچھا۔ ''میں تو آپ کے سامنے حاضر ہوں..... کسی اور کو بلانا ہو تو حکم کریں۔''

''آپ اس حوالے سے جو کچھ بھی جانتے تھے، وہ میرے علم میں آ چکا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ ذرا صفدر وزیر آبادی کو بلا لیں۔''

''ہاں، یہ آپ نے بالکل ٹھیک قدم اٹھایا ہے۔'' وہ سر ہلانے والے انداز میں بولا۔ ''یہ دونوں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ صفدر کو یقیناً انوار کی عشق بازی کی خبر ہو گی۔ وہ اس معاملے پر روشنی ڈال سکتا ہے، میں ابھی اس کو یہاں بلاتا ہوں۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

منشی عبدالغفور کی ''کوشش'' رنگ لائی اور ٹھیک پانچ منٹ کے بعد صفدر میرے سامنے کارخانے کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔

صفدر کی عمر چوبیس پچیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ وہ بھاری بھرکم جثّے کا مالک تھا۔ میں نے جامع الفاظ میں اپنی آمد کی غرض وغایت سے اسے آگاہ کیا اور آخر میں کہا۔ ''صفدر! اب تم مجھے بتاؤ گے کہ انوار (ر) نامی کسی لڑکی کی محبت میں گرفتار تھا۔ میں جانتا ہوں، تم سے یہ معاملہ ڈھکا چھپا نہیں ہوگا؟''

''مجھے انوار کی موت کا بڑا صدمہ ہے جناب!'' وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''لیکن.....!''

''لیکن'' کے بعد اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ''صفدر! اگر تمہیں اپنے دوست انوار سے واقعی ہمدردی ہے اور تمہاری خواہش ہے کہ میں اس کے قاتلوں کو عبرتناک سزا دلواؤں تو مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ.....'' میں نے دھمکی آمیز انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا پھر سنگین لہجے میں کہا۔ ''تمہاری کسی بھی غلط بیانی پر میں تمہیں گرفتار کر کے جیل بھی بھجوا سکتا ہوں۔''

''نہیں جناب! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ''میں بھی یہی چاہوں گا کہ انوار کے قاتلوں کو سخت ترین سزا ملے۔''

''تو پھر فوراً سے پیش تر تم میرے پوچھے گئے سوال کا جواب دے دو.....'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پچکارنے والے انداز میں کہا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! یہ حقیقت ہے کہ انوار ''روزی'' نامی ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ اس کا اصل نام تو روزینہ ہے لیکن سب اسے روزی کہہ کر ہی پکارتے ہیں۔ وہ روزی کا خط ملنے کے بعد ہی اس سے ملاقات کے لیے گوجرانوالہ گیا تھا۔''

میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور صفدر سے کہا۔ ''یہ بات میں جان چکا ہوں کہ یہ روزی پپلی والا میں نہیں رہتی۔ کیا تمہیں انوار نے بتایا تھا کہ وہ کس علاقے کی ہے اور پپلی والا میں وہ کس کے گھر میں آ کر ٹھہرتی ہے؟''

''جی، میں اس بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ روزی دراصل گوجرانوالہ کے ایک محلے ''بخت والا'' کی رہنے والی ہے۔ ادھر پپلی والا میں

روزی کی خالہ کا گھر ہے۔ یہ اپنی خالہ مختاراں سے ملنے اور اس کے گھر میں رہنے جاتی تھی تو اسی دوران میں ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوگئی۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔

''مختاراں کا گھر انوار کے گھر کے ساتھ جڑا ہوا ہے اسی لیے محبت کے ابتدائی مراحل میں انہیں کوئی پریشانی نہیں اٹھانا پڑی تھی۔''

''تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ مختاراں اور انوار ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں؟'' صفدر کے انکشاف نے میرے اندر ایک سنسنی سی بھر دی۔

وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''جی ہاں..... میرے کہنے کا یہی مطلب ہے، انوار نے مجھے یہی کچھ بتا رکھا ہے۔''

''انوار نے تمہیں روزینہ عرف روزی کے بارے میں اور کیا کیا بتایا تھا؟'' میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''مثلاً یہ کہ وہ محلّہ ''بخت والا'' میں کہاں رہتی ہے، اس کے ماں باپ کا نام کیا ہے..... وغیرہ وغیرہ؟''

''نہیں جناب! اس حوالے سے انوار نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔

محلّہ ''بخت والا'' میرے تھانے سے بہت قریب تھا۔ وہاں روزی اور اس کے گھر والوں کا سراغ لگانا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ یہ بات تو مجھے صدیق اینڈ کمپنی سے بھی معلوم ہو سکتی تھی کہ ان کے پڑوس میں رہنے والی مختاراں کی بہن بخت والا میں کہاں رہتی ہے۔ ویسے یہ بات بڑی زبردست تھی کہ انوار و روزی کی محبت بڑے خفیہ انداز میں کامیابی سے چل رہی تھی اور انوار کے گھر والوں کو مطلق اس بات کا احساس نہیں تھا کہ ان کا بیٹا اور مہمان پڑوسن چمنِ محبت میں کون کون سے گل کھلا رہے تھے۔

میں نے گھما پھرا کر صفدر سے گھنگریالے بالوں والے بندے کے بارے میں بھی متعدد سوالات کیے لیکن وہ مردِ مذکورہ کے حوالے سے کسی بھی نوعیت کی معلومات نہیں رکھتا تھا۔ یہی سوال میں نے ایک مختلف زاویے سے بھی پوچھ لیا۔

''صفدر! کیا انوار نے کبھی اپنے کسی رقیب کا بھی ذکر کیا تھا..... کوئی ایسا بندہ جوان کی

محبت سے جلتا ہو؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔''نہیں جناب.....اس قسم کی کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

صفدر مجھے جس حد تک معلومات فراہم کر چکا تھا وہ میرے لیے کافی تھیں۔ وہاں مزید رک کر وقت ضائع کرنا بے وقوفی ہوتی لہٰذا میں نے صفدر کو مختلف قسم کی احتیاطی ہدایات دیں اور منشی عبدالغفور سمیت صفدر کا بھی شکریہ ادا کرنے کے بعد، کھیلوں کا سامان بنانے والے اس کارخانے سے نکل آیا۔

ایک بات کا میں ذکر کرنا بھول گیا۔ میں نے صفدر سے انوار کے نیلے بیگ کے بارے میں پوچھا تھا اراس نے بھی اس امر کی تصدیق کر دی تھی کہ اس بار انوار اپنا وہ سفری بیگ گھر میں ہی چھوڑ گیا تھا اور جاتے وقت اس نے صفدر کو بتایا تھا کہ وہ ایک دو روز میں واپس آ جائے گا۔

✠ ✠ ✠

میں اس روز یعنی پندرہ فروری کو دوپہر کے وقت سیالکوٹ سے واپس اپنے تھانے آ گیا۔ اس وقت تک اسپتال سے مقتول انوار کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش نہیں آئی تھی۔ میں نے اے ایس آئی منظور احمد کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

''میں ایک چکر پپلی والا کا لگا آؤں پھر تمہاری چھٹی ہے۔''

اس نے فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔''آپ کے چہرے پر چھلکنے والے جوش سے پتا چلتا ہے کہ سیالکوٹ سے آپ کوئی اہم سراغ لے کر آئے ہیں؟''

''بالکل ایسی ہی بات ہے منظور احمد۔''میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو بعد میں، آرام سے بیٹھ کر ہوگی۔ ابھی میں بہت جلدی میں ہوں، میرا فوری طور پر پپلی والا پہنچنا بہت ضروری ہے۔''

''او کے ملک صاحب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کانسٹیبل علی مراد کو ساتھ لیا اور پپلی والا جانے کے لیے تھانے سے نکلنے ہی والا تھا کہ کانسٹیبل حشمت اللہ میرے پاس آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں

نے سرسری لہجے میں کہا۔

''ہاں حشمت.....کیا بات ہے؟''

''جناب! میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں کہا پھر کانسٹیبل علی مراد کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن تنہائی میں.....''

''ٹھیک ہے، تم اپنی اس ضروری بات کو گھنٹا، دو گھنٹا اپنے اندر روکے رکھو۔'' میں نے علی مراد کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں پپلی والا سے واپس آنے کے بعد تمہاری رام کہانی سنوں گا.....او کے؟''

''ٹھیک ہے جناب۔'' وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے کانسٹیبل حشمت اللہ کو نظر انداز کیا اور کانسٹیبل علی مراد کے ساتھ پپلی والا روانہ ہو گیا۔

صدیق اینڈ کمپنی نے میرے چہرے سے جھلکنے والے دبے دبے جوش کو محسوس کر لیا تھا۔ طفیل نے مجھ سے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! لگتا ہے آپ نے انوار کے قاتل کا سراغ لگا لیا ہے؟''

''ہاں، تمہارا اندازہ بالکل درست ہے طفیل۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اور آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے میں قاتل تک رسائی بھی حاصل کر لوں گا۔''

میں عام طور پر اس قسم کے دعوے کرنے کا عادی نہیں ہوں لیکن پتا نہیں، میں اس وقت کس کیفیت میں تھا کہ ایسی وثوقی بات کہہ دی حالانکہ قاتل کے حوالے سے ابھی تک میرا اپنا ذہن بھی کلیئر نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے، میرے کہے ہوئے ان الفاظ میں بھی قدرت کی کوئی مصلحت ہو، میرا یہ ایمان ہے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اور کائنات میں رُونما ہونے والی ہر ایک چھوٹی بڑی جنبش میں اس کی کوئی نہ کوئی مصلحت چھپی ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ عام انسان اس کی مصلحتوں کو سمجھ نہیں پاتا اور الجھا رہتا ہے۔ میں نے یہاں پر عام انسان کا حوالہ دیا ہے لیکن جو لوگ اللہ کے دوست ہیں وہ اس کی منشا اور رضا سے بہ خوبی واقف ہوتے ہیں۔ آپ میرے اس یقین سے اتفاق کریں یا نہ کریں، اس سے کوئی فرق البتہ پڑتا نہیں!

میرے دعوے میں چھپی ہوئی خوشخبری نے ان تینوں کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اللہ رکھی

نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''تھانے دار جی! وہ کم ذات، شیطان کی اولاد کون ہے جس نے میرے جوان بیٹے کی جان لے لی؟''

''ابھی تک میں قاتل کے نام تک نہیں پہنچا ہوں۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''لیکن شام تک ان شاءاللہ! اس سلسلے میں مجھے ضرور کامیابی ہوگی۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔'' صدیق نے کمزور آواز میں کہا پھر پوچھا۔ ''جناب! کیا آپ کا اشارہ اسی گھنگریالے بالوں والے بندے کی طرف ہے؟''

''ہاں.....وہ بھی انوار کا قاتل ہوسکتا ہے۔'' میں نے خیال افروز لہجے میں کہا۔ ''اور کوئی دوسرا بھی۔ اصل بندے تک پہنچنے کے لیے مجھے آپ لوگوں کے سچے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''تھانے دار جی!'' اللہ رکھی مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''ہم تو آپ کے ساتھ سچا اور خاص تعاون ہی کر رہے ہیں۔''

میں نے اللہ رکھی ہی کو سوالات کی باڑ پر رکھ لیا۔ ''اللہ رکھی! تم نے کل رات بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ آج جب میں پپلی والا آؤں گا تو تم یہ معلوم کر کے رکھو گی، کس گھر میں کون سی (ر) نام کی لڑکی رہنے آئی ہوئی ہے یا.....رہنے کے لیے آنے والی ہے، اس کام کا کیا ہوا؟''

''میں نے وہ کام کر دیا ہے جی!'' وہ فخریہ انداز میں بولی۔

''مطلب یہ کہ تمہیں پتا چل گیا ہے.....'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ (ر) لڑکی کون ہے اور کس گھر میں رہنے آئی ہوئی ہے؟''

میں نے ابھی تک ان تینوں کو اپنے سیالکوٹ والی کامیابی کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ میں پہلے انہیں گھس کر دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کتنے گہرے پانی میں کھڑے ہیں۔ اس کے بعد مجھے وہ سنسنی خیز انکشاف کرنا تھا۔ میرے چبھتے ہوئے تیکھے سوال کے جواب میں اللہ رکھی نے بتایا۔

''نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتی ہوئے بولی۔ ''میں نے چنگی طراں پتا کر لیا ہے۔ یہاں پپلی والا کے کسی گھر میں کوئی (ر) نامی لڑکی مہمان بن کر نہیں آئی اور نہ ہی آنے والی ہے، میرا خیال ہے.....'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا۔ ''آپ کو انوار کی محبت کا خوامخواہ

شک ہوا ہے۔ایسا کوئی چکر سرے سے ہے ہی نہیں۔''

میں نے اللہ رکھی کے ''خیال'' کو یک سر نظر انداز کرتے ہوئے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''کیا تمہاری تحقیق اور تفتیش نے اپنے پڑوس کے دروازے پر بھی دستک دی تھی؟''

''جی.....کیا مطلب؟'' وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

دھماکا کرنے کا وقت آ گیا تھا لہٰذا میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔''مطلب یہ کہ.....کیا تم نے اپنی پڑوسن مختاراں بی بی سے بھی (ر) کے بارے میں پوچھا ہے؟''

''نہیں جی، اس کا تو مجھے دھیان ہی نہیں رہا۔'' وہ خجالت زدہ انداز میں بولی۔

میں نے کہا۔''ایسی ہی صورت حال کے لیے کہا جاتا ہے..... چراغ تلے اندھیرا.....!''

صدیق نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔''تھانے دار جی! ہماری پڑوسن مختاراں کو کیا ہوا ہے؟''

''مختاراں کو تو کچھ نہیں ہوا لیکن اس کی بہن کو..... بلکہ اس کی بھانجی روزینہ عرف روزی کو بہت کچھ ہونے والا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر اللہ رکھی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔''کیا یہ سچ ہے کہ مختاراں کی ایک بہن ادھر محلہ بخشے والا میں رہتی ہے؟''

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔''جی، یہ بات سچ ہے۔''

''اور اس بات میں بھی کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ مختاراں کی بھانجی روزینہ عرف روزی عرف (ر) گاہے بہ گاہے اپنی خالہ کے گھر پیلی والا میں رہنے آتی ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔''اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ انہی دنوں انوار بھی کارخانے سے چھٹی لے کر یہاں چلا آتا تھا.....؟''

''تو.....تو.....تو.....؟'' اللہ رکھی ایک ہی لفظ کی تکرار کے بعد سنسنی خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے بھی اسی کے انداز میں جواب دے دیا۔''جی.....جی.....جی.....!''

''یہاں اتنا کچھ ہوتا رہا اور ہمیں پتا نہیں چلا۔'' صدیق نے حد درجہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''وہ اس لیے پتا نہیں چلا کہ تم لوگ الو کے پٹھے ہو۔'' میں نے تلخی سے کہا۔''تم لوگوں کی

ناک کے نیچے سب کچھ ہوتا رہا اور تمہیں کوئی خبر ہی نہیں..... تم اندھے اور گونگے بہرے بنے رہے.....'' میں نے تھوڑا وقفہ دے کر ایک سکون آور سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے انوار کے دوست اور روم میٹ صفدر وزیر آباد کی زبانی حقیقت کا پتا چل گیا ہے۔ میں بخت والا میں مختاراں کی بہن کے گھر کا دروازہ کھٹاؤں گا پھر روزی میری سامنے ہوگی۔ روزی جب میرے قابو میں آ جائے گی تو پھر اس کی زبان سے یہ اگلوانے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں رہے گا کہ اس نے خط لکھ کر انوار کو پیلی والا بلایا تو وہ خود یہاں کیوں نہیں پہنچی اور..... یہ کہ ان کی محبت سے کون جلتا تھا..... کون تھا انوار کا دشمن.....؟''

تھوڑی دیر پہلے جب اللہ رکھی مجھے اپنی کارکردگی سے آگاہ کر رہی تھی تو اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے پڑوس میں ابھی روزی رہنے کے لیے نہیں آئی ہوئی۔ یہ انکشاف اس نے میری ڈانٹ کے نتیجے میں کیا تھا کہ انہیں اپنے پڑوس کی بھی خبر نہیں..... بچہ بغل میں، ڈھنڈورا شہر میں..... اور..... چراغ تلے اندھیرا..... کی مثالیں بھی میں نے دی تھیں۔

وہ تینوں الجھن زدہ اور تشویش بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے باری باری ان تینوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مختاراں کی بہن اور بھانجی (ر) کے گھر کا پتا معلوم کرنے کے لیے مجھے تمہارے پڑوس کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا یا تم میں سے کوئی روزی کے گھر سے واقف ہے؟''

''میں بتاتی ہوں جی!'' اللہ رکھی جلدی سے بولی۔ ''مختاراں کی بہن سلطانہ بی بی بخت والا میں گیپ کے قریب رہتی ہے۔ ادھر مسجد والی گلی میں اس کا گھر ہے۔ روزی کے باپ کا نام یوسف علی ہے۔ یوسف نے اسی علاقے میں آرا مشین لگا رکھی ہے۔ روزی ان کی اکلوتی لڑکی ہے۔ اگر آپ گیپ (بخت والا کے ایک مخصوص حصے کا نام) پر پہنچ کر کسی سے بھی یوسف آرے والا کے بارے میں پوچھیں گے تو وہ سیدھا آپ کو اس کے گھر تک پہنچا دے گا..... مسجد والی گلی میں۔ یہ ساری تفصیل مجھے سلطانہ نے بتائی تھی۔ وہ جب بھی اپنی بہن مختاراں سے ملنے آتی تھی تو ہمارے گھر میں بھی اس کا آنا ہوتا تھا۔ میرے گھر میں تو روزی بھی آیا کرتی تھی لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ.....!'' اس نے افسوس بھرے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے جلدی سے کہا۔

''اللہ رکھی! کمان سے نکلا ہوا تیر، زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اور گزرا ہوا وقت کبھی

واپس نہیں آتا اس لیے پچھتانے یا اظہارِ افسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب آگے کیا ہوگا، آپ لوگوں کے لیے میرا ایک مشورہ ہے.....!''

وہ تینوں سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''روزی اس وقت اپنی خالہ کے گھر میں موجود نہیں۔ میں یہاں سے سیدھا بخشے والا جا رہا ہوں، یوسف آرے والے کے گھر۔ جب تک میں وہاں اپنی کارروائی مکمل نہ کرلوں، آپ اپنے پڑوسیوں کو میرے مشن کی ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا؟''

ان تینوں نے بڑے بھرپور انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

میں جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ صدیق نے حسرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''انوار کی لاش آج ہمیں مل جائے گی نا؟''

یہ سوال وہ پہلے بھی دو تین مرتبہ مجھ سے پوچھ چکا تھا۔ وہ جس صدمے سے گزر رہا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اگر سو مرتبہ بھی مجھ سے یہ سوال کرے تو مجھے جواب دینا ہے۔ میں نے ٹھہرے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''مجھے پوری امید ہے کہ شام سے پہلے اسپتال والے انوار کی لاش کو تھانے پہنچا دیں گے۔ میں تمہارے بھائی طفیل کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ جیسے ہی انوار کی لاش تھانے پہنچے گی، میں ضروری کارروائی کے بعد طفیل کے ہاتھ اسے پبلی والا روانہ کردوں گا۔ ان کے ساتھ میں اپنے تھانے کے دو سپاہی بھی بھیج دوں گا تاکہ راستے میں کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔''

''جی بہت بہت شکریہ آپ کا۔'' وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا۔

میں اور کانسٹیبل علی مراد طفیل کے تانگے پر سوار ہو کر تھانے کی طرف چل پڑے۔ راستے میں، میں نے علی مراد سے پوچھا۔

''یار علی مراد، میں نے تمہارے ذمے ایک کام لگایا تھا اس کا کیا ہوا؟''

''وہ گھنگریالے بالوں والے بندے کا کام جی.....!''

''ہاں، میں اسی نامعلوم، نامراد کی بات کر رہا ہوں۔''

''میں نے آس پاس کے علاقے کی ری سرچ مکمل کر لی ہے جناب۔'' علی مراد نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ ''میں ابھی تک گھنگریالے بالوں والے دو افراد کو ڈھونڈ پایا ہوں جناب۔''

''کون ہیں وہ دونوں؟'' میں نے پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

''ایک کا نام احسان اور دوسرے کا مشتاق عرف مشتا قا ہے جی۔'' علی مراد نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ دونوں کرتے کیا ہیں اور.....ان کے گھر کس طرف ہیں؟''

''احسان تو جناب برف بنانے والے کارخانے میں کام کرتا ہے۔'' علی مراد نے بتایا۔ ''اس کا گھر سبزی منڈی کے قریب ہے۔ تھانے کے اس طرف.....'' اس نے مغرب کی سمت اشارہ کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اور یہ مشتا قا گیپ کے پاس، مسجد والی گلی میں رہتا ہے.....''

میں اچھل پڑا۔ تھوڑی دیر پہلے صدیق کے گھر میں گیپ اور مسجد والی گلی کا خاصا ذکر ہوا تھا اور یہ ذکر روزی کے حوالے سے تھا۔ اس کا مطلب تھا، اس کیس کی کڑیاں ایک ایک کر کے آپس میں ملنے لگی تھیں۔ مشتا قا گھنگریالے بالوں والا اور روزی میں کوئی تعلق یقیناً ہو سکتا تھا۔ اگر میں گیپ کو مرکزِ نگاہ بنا کر کیس کا گیپ بھرڈالتا تو قاتل کی گردن میری مضبوط گرفت میں آ سکتی تھی۔ میں نے سنسنی خیز لہجے میں علی مراد سے کہا۔

''علی مراد! اس مشتا قا کے بارے میں تمہاری ریسرچ مزید کیا کہتی ہے؟''

''جناب!'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''مشتاق عرف مشتا قا مسجد کے امام صاحب کا بیٹا ہے جناب۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ والی گلی ہی میں رہتا ہے۔ مشتا قا کوئی کام وام لگ کر نہیں کرتا۔ اکثر آوارہ گھومتا نظر آتا ہے۔''

میرے مطلوبہ بندے یعنی متوقع قاتل کی خوبیاں ایک ایک کر کے مشتا قا میں جمع ہوتی جا رہی تھیں، میں نے علی مراد سے پوچھا۔

''تم نے بتایا ہے کہ مشتا قا اور اس کی ماں مسجد والی گلی ہی میں رہتے ہیں، تو کیا اس کا اپ ان کے ساتھ نہیں رہتا؟''

''مولوی خیر دین امام مسجد کچھ عرصہ پہلے تک گھر میں ان کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔'' علی

مراد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن بیٹیوں کی شادی کے بعد اس نے گھر چھوڑ دیا ہے اور اب اس کا مستقل ٹھکانا مسجد کے اندر ہی ہے۔''

''اس ہجرت کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''جی..... ہے خاص وجہ بھی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مولوی خیر دین کو اپنی بیوی اور بیٹے سے ڈھیروں شکایات ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ اس کی بیوی زاہدہ بڑی بدزبان عورت ہے اور مشتاقا بھی سرکشی اور نافرمانی کی آخری منازل سے گزر رہا ہے۔ مشتاقا سے بڑی خیر دین کی دو بیٹیاں جمیلہ اور صفیہ ہیں۔ وہ ان کی شادی تک مجبوراً گھر میں رکا رہا، جیسے ہی بیٹیاں رخصت ہوئیں، مولوی خیر دین نے گھر کو خیر باد کہہ کر مسجد میں ڈیرا لگا لیا۔ جب بیوی اور بیٹے کو سمجھانے کی ہر کوشش ناکامیاب ہوگئی تو اس نے یہی فیصلہ کیا کہ کنارہ کشی ہی اس مسئلے کا حل ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا مولوی خیر دین گیپ والی مسجد ہی میں امامت کرواتا ہے؟''

علی مراد نے اثبات میں جواب دیا۔

طفیل نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ''تھانے دار صاحب! روزینہ عرف روزی بھی تو گیپ کے قریب مسجد والی گلی ہی میں رہتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں، آپ مشتاقا کو شناخت کے لیے تھانے بلوالیں۔ میں غنی کو چوان کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر لے آتا ہوں۔ وہ مشتاقا کو دیکھ کر فوراً بتا دے گا کہ کیا اس رات یہی بندہ شیخوپورہ موڑ سے اس کے تانگے پر سوار ہوا تھا یا وہ گھنگریالے بالوں والا کوئی اور تھا.....!''

طفیل کی تجویز میرے دل کو لگی۔ میں نے اس آئیڈیا میں تھوڑا سا اضافہ کرتے ہوئے علی مراد سے کہا۔

''علی مراد! تھانے پہنچنے کے بعد تم دونوں گھنگریالے بالوں والے بندوں کو لانے کے لیے روانہ ہو جانا۔ ہمارے پاس ایک ایسا آدمی ہے جو مطلوبہ بندے کی شناخت کر سکتا ہے۔ تمہیں اس کام میں کوئی دشواری تو نہیں ہوگی؟''

''دشواری کیسی جناب۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں تھانے کے سامنے تانگے سے اتر جاؤں گا اور پھر احسان و مشتاقا کو لے کر ہی واپس آؤں گا۔''

''شاباش!'' میں نے تعریفی نظر سے علی مراد کی طرف دیکھا۔

''اور اس دوران میں، میں عبدالغنی کو بھی لے کر آپ۔ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔'' محمد طفیل نے پُرعزم انداز میں کہا۔

میں نے طفیل کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے نعرے کو دہرا دیا۔ ''شاباش.....!''

ہم اسی موضوع پر باتیں کرتے ہوئے تھانے پہنچ گئے۔

✠ ✠ ✠

میں نے اپنے طور پر یہ سوچ لیا تھا کہ پہلے مشتاقا اور احسان والا معاملہ صاف ہو جائے پھر میں ''روزی'' کے گھر کا رخ کروں گا۔ میں نے تھانے پہنچ کر اے ایس آئی منظور احمد کو ''چھٹی'' دی اور اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ کانسٹیبل حشمت اللہ میرے پاس آ گیا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے بیٹھنے کو کہا اور پوچھا۔

''ہاں بتاؤ.....تم مجھ سے کیا کہنے والے تھے؟''

''جناب! مجھ سے ایک کوتاہی ہوگئی ہے۔'' وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے ڈر ہے، آپ ناراض ہو جائیں گے.....!''

''کیا میری ناراضگی سے تمہاری اس کوتاہی کی تلافی ہو جائے گی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں جناب.....'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جو غلطی ہو گئی، سو ہو گئی.....!''

''تو بس سمجھ لو کہ میں تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''اب جلدی سے بتا دو، تم سے کون سی سنگین غلطی سرزد ہوئی ہے؟''

میرے سوال کے جواب میں کانسٹیبل حشمت اللہ نے مجھے بتایا۔ ''جناب! میں آپ کے ساتھ اس روز ادھر پپلی والا گیا تھا۔ جائے وقوعہ سے آپ نے مجھے لاش کے ساتھ اسپتال بھیج دیا تھا اور.....''

''ہاں، ہاں.....'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ مجھے سب یاد ہے، تم اپنی

کوتاہی کے بارے میں بتاؤ، کیا تم نے انوار کی لاش کی بے حرمتی کر دی تھی؟''

''اللہ اس قسم کی غلطی سے بچائے جناب۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ''میں زندہ انسانوں کی طرح مُردوں کا بھی بڑا احترام کرتا ہوں۔ میں دراصل آپ کو ایک شے کے بارے میں بتا رہا تھا جو اس روز مجھے جائے وقوعہ سے ملی تھی اور میں آپ کو دکھانا بھول گیا.....!''

''کون سی شے حشمت اللہ!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''دکھاؤ مجھے.....''

وہ اپنی جیب میں سے مذکورہ شے نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہے وہ شے جناب!''

میں نے بہ غور اس شے کا معائنہ کیا۔ وہ موتیوں کی دو جڑواں لڑیاں تھیں جن کی لمبائی اور دونوں سروں پر بڑھے ہوئے دھاگوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ کلائی میں پہننے کے لیے تیار کی گئی تھیں۔ باہم جڑی ہوئی دونوں لڑیوں میں سے ایک میں فیروزی موتی اور دوسری میں سفید موتی پروئے گئے تھے۔ ان موتیوں کو لڑیوں میں پرونے کے بعد ان کے سروں پر باقاعدہ مضبوط گرہیں لگائی گئی تھیں تا کہ لڑیوں کے ٹوٹنے پر موتیوں کو بکھرنے کا موقع نہ مل سکے۔ اس دہری لڑی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ افراتفری کے عالم میں، وہ کسی کی کلائی سے ٹوٹ کر گری ہوگی۔ وہ کلائی مردانہ بھی ہو سکتی تھی اور زنانہ بھی.....! آسانی کے لیے یہ سمجھ لیں کہ وہ دیسی ساخت کا ایک سادہ سا ''بریسلٹ'' تھا۔

میں نے حشمت اللہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تو یہ لڑی تمہیں جائے وقوعہ سے ملی تھی؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں نے اسے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا تھا لیکن آپ کو بتانا یاد نہیں رہا، پھر میں انوار کی لاش کے ساتھ اسپتال چلا گیا تو یہ لڑیاں میرے ذہن ہی سے نکل گئیں۔ آج صبح میری بیوی نے یونیفارم دھونے سے پہلے جیبوں وغیرہ کو ٹٹولا تو یہ ایک جیب میں سے برآمد ہوئی۔ میں دن میں آپ کو اسی کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا لیکن آپ کو اس وقت پہلی والا جانے کی جلدی تھی۔ اب آپ ملے ہیں تو میں نے آپ کو ساری بات بتا دی ہے۔''

''اسی کو کہتے ہیں..... دیر آید درست آید!'' میں نے اس ''بریسلٹ'' کو اپنے ہاتھوں

میں گھماتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔

یہ محاورہ حشمت اللہ کی سمجھ میں ٹھیک طرح سے بیٹھ نہیں سکا تھا، وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''جی..... کس کو کیا کہتے ہیں.....؟''

میں نے اس کی تسلی کے لیے کہہ دیا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تم سے بالکل بھی ناراض نہیں ہوں۔ تم جاؤ..... اور پوری دیانت داری سے اپنی ڈیوٹی پر لگ جاؤ۔'' حشمت اللہ نے مجھے سیلوٹ مارا اور شکریہ ادا کر کے میرے کمرے سے نکل گیا۔

''بریسلٹ'' بے چارے کی میرے خیال میں کوئی تذکیر و تانیث نہیں ہوتی۔ میرا ذاتی خیال یہی تھا کہ مذکورہ بریسلٹ کسی مرد کی کلائی سے ٹوٹ کر جائے وقوعہ پر گرا ہوگا۔ وہ کلائی مقتول انوار کی بھی ہو سکتی تھی یا اس کے قاتلوں میں سے بھی کسی کی ہو سکتی تھی اور اس بات کا بھی امکان تھا کہ یہ بریسلٹ قتل کی اس واردات سے پہلے ہی قوعہ پر پڑا ہوا اور موجودہ کیس سے اس کا کوئی تعلق ناتا ہی نہ ہو۔ بہر حال، میں نے فیصلہ کر لیا کہ احسان اور مشتاق کی شناخت پریڈ کے ساتھ ہی میں اس ٹوٹے ہوئے بریسلٹ کو بھی پہچان کے مراحل سے ضرور گزاروں گا۔ بریسلٹ کی صورت میں، اس کیس میں ایک نیا ٹوئسٹ آ گیا تھا..... جو نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا تھا۔

✠ ✠ ✠

خدا نے میری لاج رکھ لی۔ اس دن کا سورج غروب ہونے سے پہلے قاتل میری مٹھی میں تھا۔ میں نے اللہ رکھی کے سامنے غیر ارادی طور پر جو دعویٰ کیا تھا، وہ قدرت نے پورا کر دکھایا تھا اور میں سمجھتا ہوں، اس میں میرا کوئی خاص کمال نہیں تھا۔ یہ سب دستِ قدرت کی مہربانی سے ہوا تھا۔ میں تو ایک خاص سمت میں کوشش کر رہا تھا۔ حالات خود بہ خود ایک زنجیر کی شکل اختیار کرتے گئے تھے۔ آپ یقیناً میری ان باتوں سے الجھن محسوس کر رہے ہوں گے اس لیے تھوڑی وضاحت کر دیتا ہوں۔ اس روز سہ پہر میں، پے در پے تین ایسے واقعات رُونما ہوئے کہ جنھوں نے اس کیس کا پانسا پلٹ کر رکھ دیا تھا۔

نمبر ایک..... میں تھانے میں بیٹھا، بریسلٹ سے کھیلتے ہوئے انوار مرڈر کیس کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھا کہ اسپتال سے انوار کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش آ گئی۔ ابتدائی رپورٹ کے

مطابق مقتول کی موت چودہ فروری کی رات لگ بھگ نو بجے واقع ہوئی تھی۔اس کی موت کا سبب سر میں لگنے والی وہ شدید چوٹیں تھیں جنہوں نے اس کی کھوپڑی چٹخا کر رکھ دی تھی۔ میں نے ضروری کاغذی کارروائی پوری کی اور محمد طفیل کو چوان کا انتظار کرنے لگا جو اپنے ایک پیٹی بھائی عبدالغنی کو تلاش کرنے نکلا ہوا تھا۔انوار کی لاش کو طفیل ہی نے پہلی والا پہنچایا تھا۔

میرے انتظار کو طوالت کا منہ نہیں دیکھنا پڑا اور وہ دونوں ''پیٹی بھائی'' تھانے پہنچ گئے۔ اس وقت تک کانسٹیبل علی مراد اپنے مشن سے واپس نہیں لوٹا تھا۔احسان اور مشتاقا کی آمد کے بعد ہی کوچوان عبدالغنی کا ''کام'' شروع ہونا تھا۔

نمبر دو.....اچانک میرے ذہن میں خیال ابھرا کہ مجھے بریسلٹ کے بارے میں ان دونوں سے بھی پوچھ گچھ کرنا چاہیے۔میں نے ان کی آمد سے پہلے مذکورہ بریسلٹ کو اپنی میز کی دراز میں ڈال دیا تھا۔میں نے بریسلٹ کو باہر نکال کر انہیں دکھاتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا تم میں سے کوئی اسے پہچانتا ہے؟''

انہوں نے بڑی توجہ سے بریسلٹ کو دیکھا۔اس دوران میں، میں بہ غور ان کے چہروں پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔غنی کوچوان کا چہرہ تو نارمل نظر آ رہا تھا مگر طفیل کوچوان کی آنکھوں میں الجھن اور پیشانی پر مجھے گہرا تذبذب دکھائی دیا۔میں یہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا کہ دال میں کچھ کالا ہے.....اس احساس کے ساتھ ہی میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''کیا ہوا طفیل.....تم کس سوچ میں غرق ہو گئے؟''

''تھانے دار صاحب!'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔''آپ کو یہ لڑیاں کہاں سے ملی ہیں؟''

''تمہارے بھتیجے انوار کی لاش کے آس پاس سے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''کیا تمہیں اس کے بارے میں کچھ پتا ہے؟''

''جناب! ایسی لڑیاں تو میں نے بھاجا کی کلائی پر دیکھی ہیں۔'' اس نے بڑے اعتماد سے بتایا۔

''یہ بھاجا کون ہے؟'' میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔

''بھاجا کا اصل نام اعجاز ہے۔'' طفیل نے بتایا۔''وہ ہمارے ہی گاؤں پہلی والا کا رہنے

والا ہے۔ بڑا ہی آوارہ اور اوباش بندہ ہے جناب!''

طفیل کے انکشاف نے میرے وجود میں سنسنی سی دوڑا دی۔ میں نے تصدیقی لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ لڑیاں تم نے بھاجا کی کلائی پر ہی دیکھی تھیں؟''

''جی، مجھے پکا یقین ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔

''ٹھیک ہے طفیل!'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تم انوار کی لاش کو لے کر فوراً پپلی والا روانہ ہو جاؤ۔ تمہارے ساتھ میں اپنے دو بندوں کو بھیج رہا ہوں۔ وہ اعجاز عرف بھاجا کو گرفتار کر کے میرے پاس لائیں اور گرفتاری میں تم میرے بندوں کی بھرپور مدد کرو گے؟''

طفیل نے اپنے تعاون کا یقین دلایا تو میں نے حوالدار صمد خان اور کانسٹیبل حشمت اللہ کو بھاجا کی گرفتاری کے لیے، طفیل کے ہمراہ پپلی والا روانہ کر دیا۔

نمبر تین..... کو چوان عبدالغنی کو میں نے اپنے پاس روک لیا تھا، تھوڑی ہی دیر کے بعد کانسٹیبل علی مراد گھنگریالے بالوں والے دو بندوں کو پکڑ لایا۔ میں نے حشمت کو مذکورہ دونوں بندوں سمیت اپنے کمرے میں بلا لیا۔ جب عبدالغنی کی ان پر نظر پڑی تو وہ مشتاقا کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے چیخ سے مشابہ آواز میں بولا۔

''یہی ہے..... وہ بندہ..... بالکل یہی ہے.....!''

اس صورت حال نے مشتاقا کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا اور اس نے الٹے پاؤں کمرے سے فرار ہونے کی کوشش کی جبکہ احسان الجھن زدہ نظر سے یہ منظر دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس موقع پر کانسٹیبل علی مراد نے بڑی پھرتی دکھائی اور اڑنگا لگا کر مشتاقا کو منہ کے بل زمین پر گرا دیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔ اگلے چند منٹ میں مشتاقا کی کلائیوں میں آہنی زیو پہنایا جا چکا تھا۔ میں نے اسے حوالات میں ڈالنے کے بجائے ادھر اپنے کمرے ہی میں فرش پر بٹھا دیا اور احسان کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد حوالدار صمد بھاجا نامی اس لفنگے کو گرفتار کر کے لے آیا۔ بھاجا شکل ہی سے چھٹا ہوا بدمعاش نظر آتا تھا۔ مجھے فوراً یاد آ گیا کہ میں نے اسے جائے واردات پر بھی لوگوں کے درمیان دیکھا تھا۔ بھاجا نے مشتاقا کو میرے کمرے کے فرش پر زیر حراست بیٹھے دیکھا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ صمد خان نے بھاجا کو میری ہدایت کے مطابق یہ نہیں بتایا تھا کہ

اسے کس جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ مشتاقا پر نظر پڑتے ہی بھاجا کا دماغ گھوم گیا اور وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

''تو تم نے سب کچھ بک دیا ہے.....؟''

اس کا مخاطب مشتاقا تھا۔ مشتاقا نے پریشانی کے عالم میں وضاحت کی۔

''میں نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا۔ تم خوامخواہ مجھ پر شک نہ کرو۔ ان لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے.....!''

''بڑی شدید نوعیت کی غلط فہمی ہوئی تھی مجھے!'' میں نے باری باری دونوں زیر حراست افراد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنگین لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم لوگوں کے بے ساختہ ''سوال و جواب'' نے ساری غلط فہمی دور کر دی ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد دھمکی آمیز انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں شرافت سے اقبال جرم کرتے ہو یا میں کوئی اور طریقہ استعمال کروں.....؟''

''اقبال جرم.....؟'' مشتاقا حیرت کی اداکاری کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔ اس کے استفسار میں زیادہ جان نہیں تھی۔

''جناب! کون سا جرم.....ہم نے کیا کیا ہے؟'' بھاجا نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔ یہ ایک خانہ پُری تھی۔

''اس کا مطلب ہے، شرافت تم لوگوں کو راس نہیں آئے گی۔'' میں نے پوری سفاکی سے کہا پھر صمد خان کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''خان صاحب! یہ دونوں مرغے ایک گھنٹے کے لیے میں آپ کی تحویل میں دے رہا ہوں۔ مغرب کی اذان سے پہلے ان کی بانگ ٹرائل روم میں گونجنی چاہیے.....آپ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''بڑی چنگی طراں سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!'' صمد خان انہیں قصاب کی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''صرف بانگ ہی نہیں جناب..... یہ تو دردناک آواز میں نوحے بھی پڑھیں گے!''

صمد خان نے اپنا کہا سچ کر دکھایا، چند لمحات کے بعد تفتیشی کمرے کی جانب سے اذیت میں ڈوبی ہوئی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ یہ ٹرائل ایک گھنٹے تک جاری رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر ہی ان دونوں ڈشکروں نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ انہوں نے مل کر

انوار کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں نے انہیں حوالات میں فٹ کر دیا۔

میں نے اسی رات مغرب کی نماز کے بعد روزینہ عرف روزی کے گھر کا رخ کیا۔ میرے تیکھے سوالات کے جواب میں پہلے تو وہ مجھے دائیں بائیں گھمانے کی کوشش کرتی رہی لیکن جب میں نے سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے اسے بتایا کہ انوار کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے اور مشتاقا و بھاجانے یہ جرم بھی قبول کر لیا ہے لہٰذا اگر وہ حقیقت کو چھپائے گی تو قانون کی نظر میں مجرم ٹھہرے گی۔ میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور رہی سہی حقیقت بھی اس کی زبان مجھ تک پہنچ گئی۔

روزینہ اور انوار ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور ان کی چاہت مشتاقا کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی کیونکہ محلے دار بلکہ گلی دار ہونے کے ناتے وہ بھی روزینہ کا طلب گار تھا۔ دوسری طرف روزینہ کو مشتاقا کی صورت سے نفرت تھی۔ مشتاقا اپنی بے عزتی کو برداشت کر رہا تھا۔ اسی دوران میں اس کا دوست بھاجا گاہے بہ گاہے اسے پپلی والا کے رنگین و سنگین قصے سناتا رہتا تھا جس سے مشتاقا کا دماغ خراب ہو گیا اور اس نے انوار کو اپنا رقیب اور راہ کا خار سمجھنا شروع کر دیا، پھر یہ نفرت اس عروج تک جا پہنچی کہ مشتقاقا نے انوار کی جان لینے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں دوستوں نے باہمی مشاورت سے ایک سازشی منصوبہ بنایا اور روزینہ کی جانب سے ایک نقلی خط لکھ کر انوار کو سیالکوٹ سے گوجرانوالہ بلا لیا۔ یہ ''راز'' مشتاقا کے علم میں آ چکا تھا کہ روزینہ کو جب بھی پپلی والا رہنے جانا ہوتا تھا، وہ انوار کو اسی طرح خط لکھ کر اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا کرتی تھی۔

مولوی خیر دین کی پرہیز گاری، صالح عملی اور نیک کرداری میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ ایک شریف النفس عالم باعمل تھا۔ اگر اس کے گھر میں مشتاقا جیسا شیطان صفت پیدا ہو گیا تھا تو اس میں اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں تھا.....!

# اس کی خاطر

ایک دفعہ کا ذکر ہے..... کسی گاؤں میں دو دوست رہتے تھے، شکیل اور جمیل۔ لوگ ان کی دوستی کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ پھر ایک روز ان کی دوستی میں ایک دراڑ پڑ گئی۔ وہ دراڑ بڑی خوبصورت تھی۔ اس نے ان کی دوستی کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ پھر کچھ بھی باقی نہ رہا..... کچھ بھی نہیں!

ہمارے زمانے میں تو کوئی بھی کہانی اسی انداز میں شروع ہوا کرتی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جہاں ہر شے میں نوع بہ نوع تبدیلی آتی ہے وہیں پر کہانی کہنے، پڑھنے اور سننے کا انداز بھی بدل کر رہ گیا۔ آج کل آپ کی سماعت اور بصارت کچھ اس ڈھنگ کی عادی ہو چکی ہے.....!

ایک روز میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو پتا چلا کہ دو آدمی کسی کی موت کی اطلاع لے کر آئے ہیں۔ میں نے مذکورہ افراد کو فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔

ان میں ایک جوان اور دوسرا ادھیڑ عمر تھا۔ جوان کا نام عارف اور ادھیڑ عمر کا نام یوسف معلوم ہوا۔ مَیں نے رسمی علیک سلیک کے بعد انہیں بیٹھنے کے لیے کہا پھر سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ لوگ اسی علاقے کے رہنے والے ہو یا کہیں اور سے آئے ہو؟''

''جناب! ہم صورت نگر سے آئے ہیں۔'' ادھیڑ عمر یوسف نے جواب دیا۔

صورت نگر نامی گاؤں میرے تھانے سے تین میل کے فاصلے پر جنوبی سمت میں واقع تھا اور یہ کہ اس کا شمار میرے تھانے کی حدود ہی میں ہوتا تھا۔ میں نے باری باری دونوں کے چہرے کا جائزہ لیا اور استفسار کیا۔

''مجھے پتا چلا ہے، تم لوگ کسی کے انتقال کی خبر لے کر آئے ہو؟''

''جی ہاں!'' اس بار بھی یوسف ہی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''ملنگ بابا فوت ہو گئے ہیں.....!''

''ملنگ بابا.....!'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''یہ کون ہے اور.....اس کی موت کا تھانے سے کیا تعلق؟''

''جناب! ملنگ بابا ہمارے گاؤں سے باہر، پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھے رہتے تھے۔'' عارف نے بتایا۔ ''یہ بہت پہنچے ہوئے بابا تھے۔ گاؤں والے ان کی بڑی عزت اور احترام کرتے تھے۔ وہ بالکل خاموش رہتے تھے۔ آج تک کسی نے انہیں بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جو بھی ان کے پاس کسی بھی حاجت کے لیے جاتا، وہ چپ چاپ اس کے لیے دعا کر دیتے تھے.....'' وہ لمحے بھر کے توقف کے بعد پھر بولا۔

''ملنگ بابا اللہ کے بہت قریب تھے۔ ان کی اکثر دعائیں قبول ہو جاتی تھیں۔ چودھری صاحب بھی انہیں بہت مانتے تھے۔''

''کون چودھری صاحب؟'' عارف کے خاموش ہوتے ہی میں نے پوچھ لیا۔ ''چودھری وحید صاحب.....یہ ہمارے گاؤں کے چودھری صاحب ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ آپ لوگوں نے ملنگ بابا کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، میں مانتا ہوں کہ وہ اتنے ہی برگزیدہ اور پہنچے ہوئے ہوں گے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ کسی ملنگ بابا کی موت سے تھانے کا کیا تعلق نکلتا ہے۔ بھئی.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''سیدھی سی بات ہے، اگر آپ کے گاؤں کا کوئی بزرگ بابا فوت ہو گیا ہے تو اسے عین اسلامی طریقے سے قبرستان میں لے جا کر دفن کر دیں۔ اس واقعے کی تھانے میں باقاعدہ رپورٹ درج کرانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''پہلے گاؤں والوں کا یہی خیال تھا کہ ملنگ بابا کو عزت و احترام کے ساتھ دفنا دیتے ہیں۔ قبرستان میں ان کے مزار کے لیے ایک مخصوص حصے کے بارے میں بھی فیصلہ کر لیا گیا تھا۔'' یوسف نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''لیکن پھر.....!''

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوا تو میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''لیکن کیا.....؟''

''چودھری صاحب بھی ملنگ بابا کو دیکھنے آئے تھے۔'' یوسف نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتایا۔ ''ملنگ بابا کی لاش کو دیکھتے ہی وہ تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے کھل کر تو کوئی بات نہیں کی۔ بس اتنا ہی کہا کہ ہم جا کر تھانے سے پولیس کو بلا لائیں۔ پولیس کے معائنے کے بغیر ملنگ بابا کو دفن کرنا ٹھیک نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، چودھری وحید نے ملنگ بابا کی لاش میں کوئی خاص بات دیکھ لی ہے؟'' میں نے سنسناتے ہوئے انداز میں کہا۔

''لگتا تو یہی ہے تھانے دار صاحب.....لیکن چودھری صاحب نے کوئی واضح بات نہیں کی۔'' عارف نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''ہم تو حکم کے بندے ہیں جناب۔ چودھری صاحب کے حکم پر آپ کے پاس آ گئے ہیں، اب جو آپ کی مرضی.....!''

''چودھری وحید نے جب اتنی چاہت سے پولیس کو یاد کیا ہے تو تم لوگوں کے ساتھ جانا تو پڑے گا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''تم لوگ صورت نگر سے یہاں تک کیسے آئے ہو؟''

''ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے ہیں جی۔'' یوسف نے جواب دیا۔

''گھوڑوں پر.....!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اس کا مطلب ہے، تم لوگوں کے پاس الگ الگ گھوڑا ہے؟''

''جی ہاں.....!'' عارف نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''ہم دونوں کے پاس اپنا اپنا گھوڑا ہے۔''

''ہوں.....!'' اس وقت میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ میں نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم لوگ باہر برآمدے میں جا کر بیٹھو۔ ہم دس منٹ بعد نکل رہے ہیں۔''

انہوں نے میری ہدایت پر عمل کیا اور کمرے سے نکل کر برآمدے کی طرف بڑھ گئے۔

میں نے کانسٹیبل عمر دین کو آواز دے کر اپنے کمرے میں بلا لیا اور پوچھا۔ ''مہر فیروز ڈیوٹی پر آ گیا ہے؟''

مہر فیروز میرے تھانے میں اے ایس آئی تھا۔ کانسٹیبل نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے

جواب دیا۔ ''نہیں جناب.....مہر صاب تو ابھی تک نہیں آئے۔''

''ٹھیک ہے، تم حوالدار مکھن شاہ کو میرے پاس بھیجو۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

کانسٹیبل گیا اور تھوڑی دیر کے بعد مکھن شاہ میرے سامنے موجود تھا۔ میں نے حوالدار سے کہا۔ ''مجھے فوری طور پر صورت نگر جانا ہے۔ پتا نہیں واپسی کب تک ہو۔ مہر فیروز بھی ابھی تھانے نہیں پہنچا۔ تمہیں پوری طرح چوکس رہنا ہے، میں تھانہ اور یہاں کے معاملات تمہارے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔''

''آپ تھانے کی طرف سے بالکل بے فکر ہو کر جائیں ملک صاحب!'' مکھن شاہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''ویسے بھی مہر فیروز آنے ہی والا ہے۔ ہم مل جل کر یہاں کے معاملات سنبھال لیں گے۔''

''شاباش..... مجھے تم لوگوں سے یہی امید ہے۔'' میں نے تعریفی نظر سے مکھن شاہ کو دیکھا پھر اس سے پوچھا۔ ''صورت نگر تک جانے کے لیے سواری کا کیا بندوبست ہو سکتا ہے؟''

''آپ تانگے میں جانا چاہیں گے یا ایک گھوڑے سے کام چل جائے گا؟'' مکھن شاہ نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور بتایا۔ ''باہر تانگا موجود ہے لیکن کوچوان نہیں۔ اس کے علاوہ ایک صحت مند گھوڑا الگ سے کھڑا ہے۔''

''تانگا ہی مناسب رہے گا۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''کوچوان کے فرائض کانسٹیبل عمر دین ادا کر دے گا۔''

حوالدار مکھن شاہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور مذکورہ انتظامات کے لیے روانہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں اور کانسٹیبل عمر دین تانگے پر سوار ہو کر یوسف اور عارف کی رہنمائی میں صورت نگر کی سمت رواں دواں تھے۔

✠ ✠ ✠

موضع صورت نگر جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، میرے تھانے سے لگ بھگ تین میل جنوب میں واقع تھا اور وہاں تک پہنچنے کے لیے ایک چھوٹی سی نہر کو عبور کرنا تھا۔ مذکورہ نہر کی چوڑائی پندرہ فٹ کے قریب تھی اور یہ صورت نگر کے پہلو میں مشرق سے مغرب کی جانب بہتی تھی۔ صورت

نگر کی کل آبادی کم وبیش ایک ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ وہاں ایک اندازے کے مطابق، ڈھائی سو گھر آباد تھے۔ نہر کے کنارے سے صورت نگر کا فاصلہ تقریباً ساڑھے چار سو گز تھا۔ آسانی کے لیے اس فاصلے کو چوتھائی میل سمجھ لیں..... یا دو فرلانگ!

ہم نے نہر کا پل عبور کیا اور یوسف اینڈ کمپنی کی ''معیت'' میں جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ پیپل کے درخت کے نیچے لگ بھگ دو درجن افراد جمع تھے جن میں عورتوں، مردوں اور بچوں کی ملی جلی صورتیں دکھائی دیتی تھیں۔ اس سے ملنگ بابا کی ہر دلعزیزی کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ لوگ ایک دائرے کی شکل میں جائے وقوعہ پر موجود تھے۔ پولیس کی آمد پر وہ اِدھر اُدھر ہو گئے۔ بہ الفاظ دیگر انہوں نے، لاش تک ہماری رسائی کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ میں نے کانسٹیبل عمر دین کے ہمراہ جائے وقوعہ کی سمت قدم بڑھا دیے۔ یوسف اور عارف بھی ہمارے عقب میں تھے۔

یوسف نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تھانیدار صاحب! آپ ملنگ بابا کی لاش کا معائنہ کریں۔ میں چودھری صاحب کو بلاتا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا، پولیس جیسے ہی موقع پر پہنچے، انہیں ضرور بتایا جائے.....!''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ!'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا اور پیپل کے درخت کے نیچے پہنچ گیا۔

وہ خاصا پھیلا ہوا اور سایہ دار درخت تھا۔ پیپل کی چھاؤں عموماً گھنیری نہیں ہوتی لیکن عظیم پھیلاؤ کے باعث اس کی چھاؤں میں کافی گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی تھی۔ کسی عقیدت مند نے ملنگ بابا کے جسدِ خاکی کے اوپر ایک دھلی ہوئی چادر ڈال دی تھی۔ میں نے وہ چادر ہٹائی اور بیٹھ کر ملنگ بابا کی لاش کا باریک بینی سے معائنہ کرنے لگا۔

ملنگ بابا کی ڈاڑھی اور سر کے بال بے ترتیب بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے سبز رنگ کا ایک ڈھیلا ڈھالا چولا ''زیب تن'' کر رکھا تھا۔ پاؤں میں جوتا نام کی کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ گلے میں بڑے موتیوں (منکوں) کی ایک مالا بھی موجود تھی۔ یہ منکے بالکل سیاہ تھے۔ سر کے بالوں نے اس کے چہرے کے بیش تر حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے چھڑی کی مدد سے مذکورہ بالوں کو ہٹایا تو چونک اٹھا۔ اس کے بند ہونٹوں کے پاس سے، ڈاڑھی کے بال بڑے چپچپے اور عجیب سے ہو رہے تھے۔ ہونٹوں کے کنارے پر بھی مجھے بڑی سرخی نظر آئی۔ یہ سرخی خون کے سوا کسی اور چیز کی

نہیں ہوسکتی تھی۔اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ ملنگ بابا کے منہ سے خون نکل کر اس کی ڈاڑھی تک پہنچا تھا۔ میں گہری تشویش میں مبتلا ہوگیا۔

یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ میں نے ملنگ بابا کے ہونٹوں کو کھول کر دیکھا تو اس اندازے کی ایک سوایک فیصد تصدیق ہوگئی کہ مذکورہ خون ملنگ بابا کے اندر ہی سے خارج ہوا تھا۔ ایسا عموماً اسی صورت میں ہوتا ہے جب انسان کے معدے میں کوئی سریع الاثر زہر پہنچ جائے۔ان سنسنی خیز لمحات میں، میرے ذہن میں اس سنگین سوال نے سر اٹھایا۔

''کیا اس ملنگ بابا کو کسی نے زہر دے کر ہلاک کیا ہے.....؟''

تب مجھے احساس ہوا کہ چودھری وحید اللہ نے ملنگ بابا کو چپ چاپ دفن کیوں نہیں کرنے دیا تھا۔ چودھری کے ذہن میں بھی یقیناً، ملنگ بابا کے قتل کے حوالے ہی سے کوئی خطرناک سوال ابھرا ہوگا اور.....وہ تو ملنگ کا عقیدت مند بھی تھا لہٰذا اس نے پولیس کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اپنے دو بندے یوسف اور عارف میری جانب دوڑا دیے تھے۔

ملنگ بابا کا رنگ گورا اور صحت اطمینان بخش تھی۔اس کی بند آنکھوں سے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے یا پڑا گہری نیند سو رہا ہے۔ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں ملنگ بابا کی موت وحیات کے حوالے سے تذبذب پیدا ہوا لیکن پھر میں نے اس کشمکش کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ اس کے سینے میں سانس کی آمد ورفت کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے اس کی نبض ٹٹول کر اور آنکھ کھول کر بھی باریک بینی سے معائنہ کیا۔ ہر طرف یہی تاثر ابھرتا تھا کہ زندگی اس سے روٹھ کر بہت دور جا چکی ہے۔ایک بات اور میرے لیے الجھن کا باعث تھی کہ اس کی عمر زیادہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ پچیس چھبیس سے زیادہ کا نہیں تھا جبکہ اس طرح کے ملنگ وغیرہ چالیس سے اوپر کے ہوتے ہیں!

میں نے ملنگ بابا کے چہرے کو دوبارہ چادر سے ڈھکا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر جائے وقوعہ کے گردونواح کا جائزہ لینے لگا۔

صورت نگر نامی وہ گاؤں میرے تھانے کے جنوب میں، تین میل کے فاصلے پر نہر کی دوسری جانب واقع تھا۔ گاؤں کی آبادی سے کوئی سو، سوا سو گز مغرب کی طرف چلیں تو وہ پیپل کا درخت آ جاتا تھا جس کے نیچے اس وقت میں کھڑا تھا۔ پیپل کے پیڑ سے صرف بیس گز کی دوری پر

مغرب ہی کی سمت میں ایک کنواں واقع تھا جو ''بیری والا کھوہ'' کے نام سے موسوم تھا۔ اس نام کی وجہ تسمیہ بیری کا وہ درخت تھا جو کنوئیں کے پہلو میں ایستادہ تھا۔ یہ ایک جاری کنواں تھا جہاں سے گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں پینے کا پانی بھرا کرتی تھیں۔ اس کنوئیں کے قریب ہی ایک کچا کمرا بھی بنا ہوا تھا جس کا دروازہ وغیرہ نہیں تھا۔ کمرے کی حالت سے لگتا تھا کہ وہ کسی کے استعمال میں نہیں۔ پتا نہیں، وہ کمرا کب اور کس مقصد کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ مذکورہ کمرے سے آگے سرسبز اور لہلہاتے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو تاحدِ نگاہ کسی سبز قالین کے مانند پھیل کر بچھا ہوا نظر آتا تھا۔ اسی طرح صورت نگر کے شمال، جنوب اور مشرق میں بھی کھیت ہی کھیت دکھائی دیتے تھے۔ اس گاؤں کی فضا بڑی خوشگوار تھی۔ ان دنوں ویسے بھی بھادوں (ایک دیسی مہینا) چل رہا تھا۔ ساون اور بھادوں برسات کے مہینے شمار کیے جاتے ہیں۔ اس وقت بھی آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ان بادلوں کے موڈ اور مزاج سے یہی لگتا تھا کہ کسی بھی وقت بارش ہو سکتی تھی۔

میں نے موسم کی نزاکت کو ذہن میں رکھے ہوئے جلدی جلدی موقع کی کارروائی کو نمٹانا شروع کر دیا۔ ملنگ بابا کی لاش کا میں تفصیلی معائنہ کر چکا تھا۔ جائے وقوعہ کا نقشہ وغیرہ تیار کرنے کے بعد میں وہاں موجود افراد کے بیانات قلم بند کرنے لگا۔ بیس منٹ کی اس کوشش میں مجھے کام کی کسی بات تک رسائی حاصل نہ ہو سکی۔ گاؤں سے تعلق رکھنے والے تقریباً سب ہی لوگ ملنگ بابا سے بڑی گہری عقیدت رکھتے تھے اور کوئی اس کی موت یا قتل کے حوالے سے کسی قسم کی قیاس آرائی کرنے کو تیار نظر نہیں آتا تھا۔ ملنگ بابا سے ایسی انسیت اور عقیدت کے باوجود بھی حیرت انگیز طور پر کسی کو اس کا نام معلوم نہیں تھا حتیٰ کہ ان میں سے کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ ایک ملی جلی رائے کے مطابق، کوئی چھ سات ماہ پہلے وہ صورت نگر میں نمودار ہوا تھا اور پھر وہ پیپل کے درخت کے نیچے ڈیرا جما کر بیٹھ گیا تھا۔ ملنگ بابا کے بارے میں ایک خاص بات یہ بھی پتا چلی کہ وہ ہر وقت چپ چاپ رہا کرتا تھا۔

کانسٹیبل عمر دین بھی میرے ساتھ موقع کی کارروائی میں مصروف رہا تھا۔ میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''عمر دین! میرا خیال ہے! اب ہمیں اس ملنگ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوا دینا چاہیے۔ اس کی موت بہر حال طبعی نہیں ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔'' عمر دین نے تائیدی انداز میں کہا۔

''لیکن ان دونوں کا کیا کرنا ہے.....!''

''کن دونوں کا؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''وہ یوسف اور عارف!'' عمر دین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ان دو بندوں کی بات کر رہا ہوں جناب جو چودھری صاحب کو بلانے گئے ہیں۔''

''اوہ.....!'' میں متاسفانہ انداز میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کام کی مصروفیت میں وہ دونوں اطلاع کنندگان میرے ذہن سے اتر گئے تھے۔ میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''پتا نہیں، یہ دونوں کہاں رہ گئے ہیں۔ اب تک تو انہیں آ جانا چاہیے تھا.....!''

اسی لمحے ایک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''لو جی.....وہ دونوں آ گئے۔''

میں نے یہ تازہ ترین اطلاع فراہم کرنے والے کی سمت دیکھا۔ وہ ایک جانب اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے اپنی نگاہ کو اسی طرف دوڑایا تو وہ دونوں مجھے نظر آ گئے لیکن ان کے ہمراہ کوئی چودھری وودھری دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''یہ تو ''خالی ہاتھ'' ہی واپس آ گئے۔ پتا نہیں، چودھری وحید اللہ کیوں ان کے ساتھ نظر نہیں آ رہا.....!''

چند لمحات کے بعد یوسف اور عارف میرے سامنے تھے۔ میں نے چودھری کے حوالے سے سوال کیا تو یوسف نے بتایا۔

''چودھری صاحب کی طبیعت کل رات سے ٹھیک نہیں۔ انہوں نے کہا، آپ ادھر سے فارغ ہو جائیں تو حویلی میں جا کر ان سے ملاقات کر لیں۔''

یوسف کی فراہم کردہ اطلاع نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ''چودھری صاحب کی طبیعت رات سے خراب ہے تو وہ صبح ملنگ بابا کی لاش کا معائنہ کرنے کیسے آ گئے تھے اور یہ کیوں کہا کہ جب پولیس موقع پر پہنچے تو انہیں بلا لیا جائے.....؟''

''آپ کی الجھن اپنی جگہ درست ہے جناب!'' یوسف ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن حقیقت یہ ہے کہ.....!''

وہ بدستور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس بات میں کچھ غلط نہیں کہ چودھری صاحب کی طبیعت کل سے خصوصاً پچھلی رات سے ٹھیک نہیں ہے، صبح جب انہیں ملنگ بابا کے بارے میں پتا چلا

تو وہ عقیدت میں بے اختیار یہاں چلے آئے تھے پھر ملنگ بابا کی لاش کو دیکھنے کے بعد انہوں نے ہمیں آپ کی طرف بھیج دیا اور یہ بھی سچ ہے کہ آپ کے استقبال کے لیے یہاں بھی آنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اچانک ان کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی اسی لیے آپ کو حویلی میں بلایا ہے.....''

میں نے پوری توجہ سے یوسف کی بات سنی پھر کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''عمر دین! تم اسی تانگے میں ملنگ بابا کی لاش کو اسپتال لے جاؤ۔ میں چودھری صاحب سے ملنے حویلی جا رہا ہوں۔ اسپتال سے سیدھا تم تھانے آ جانا۔''

''ٹھیک ہے جناب..... جو حکم آپ کا۔'' عمر دین نے فرماں برداری سے کہا۔

میں نے عارف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی عمر دین کے ساتھ جاؤ گے، لاش کو اسپتال تک پہنچانے میں تم اس کی مدد کرو گے۔''

عارف نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

ایک عمر رسیدہ بڈھے بابے نے مجھ سے پوچھا۔ ''تھانیدار جی! کیا ملنگ بابا کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھیج رہے ہیں؟''

''ظاہر ہے بزرگو.....!'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

''ملنگ بابا تو بہت پہنچے ہوئے نیک انسان تھے۔'' بابے نے درخواست آمیز انداز میں کہا۔ ''میری مانیں تو اس کی لاش کی بے حرمتی نہ کرائیں۔ اس چیر پھاڑ سے آپ سمیت ہم سب گناہ گار ہوں گے۔''

''گناہ اور ثواب اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں اور کوئی ان کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا بزرگو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ کے یہ ملنگ بابا طبعی موت نہیں مرے۔ میرے اندازے کے مطابق، ملنگ جی کو زہر دیا گیا ہے.....!''

''زہر.....!'' بڈھا بابا چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ملنگ بابا کو زہر بھلا کون دے سکتا ہے۔ صورت نگر کا تو بچہ بچہ ان سے محبت کرتا ہے..... آپ کو..... آپ کو.....'' وہ بولتے بولتے رکا، ایک افسردہ سی سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''شاید..... آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے.....!''

''مجھے کسی قسم کی کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آپ کے چودھری صاحب کا بھی یہی خیال ہے کہ ملنگ بابا کی موت طبعی نہیں ہوسکتی اسی لیے انہوں نے تدفین رکوا کر پولیس کارروائی کرانے کا حکم دیا تھا۔ ہم چودھری وحید کے بلانے پر ہی یہاں آئے ہیں۔ اگر یہ معمول کی موت ہوتی تو ہماری بھلا کیا ضرورت تھی اور..... جہاں تک ملنگ بابا کے لیے لوگوں کی عقیدت کا سوال ہے تو.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا نام کیا ہے بابا جی.....؟''

''کرم دین.....!'' بڈھے بابے نے جواب دیا۔ ''گاؤں کے لوگ مجھے ''کرمو چاچا'' کہتے ہیں۔''

''چاچا کرمو!'' میں نے اس بڈھے بابے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تک لوگوں کی عقیدت کا سوال ہے تو یہ بات آپ بھی مانیں گے کہ جہاں دس افراد کسی سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں، وہاں ایک آدھ نفرت کرنے والا بھی موجود ہوتا ہے..... ہوتا ہے کہ نہیں؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا ہوتا ہے جناب!''

''میں نے تو دس میں سے ایک کی بات کی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور صورت نگر کی آبادی تو لگ بھگ ایک ہزار ہے۔ اگر محتاط اندازہ قائم کریں تو ایک ہزار میں سے ایک سو افراد ایسے نکل آئیں گے جو ملنگ بابا کو ناپسند کرتے ہوں گے۔ ان میں سے بچوں اور بڈھے بابوں کو ہٹا دیا جائے تو پھر بھی ملنگ بابا کو ناپسند کرنے والوں کی تعداد پچاس سے کم نہیں ہو سکتی۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیں کرمو چاچا.....؟''

وہ لاجواب سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ملنگ بابا کی لاش کو کانسٹیبل عمر دین کی نگرانی میں سرکاری اسپتال بھجوایا اور خود یوسف کے ساتھ چودھری وحید اللہ کی حویلی کی جانب چل پڑا۔

✠ ✠ ✠

چودھری وحید اللہ کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس اور پچپن کے درمیان قائم کیا۔ وہ خاصے متاثر کن ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ اس نے بڑی پُرکشش موٹی تازی مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ مختلف خدمت گاروں کی رہنمائی میں مجھے چودھری صاحب کے پاس اس کے بیڈ روم میں پہنچا دیا گیا۔ وہ اس وقت بیڈ پر نیم دراز تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بڑے پُرتپاک انداز میں ملا۔ میں اس کے بیڈ کے قریب رکھی ہوئی ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا۔ ''کیا ہو گیا چودھری صاحب۔ آپ کی طبیعت اچانک کیسے خراب ہو گئی؟''

''بس جناب! میرا دل کمزور ہو گیا ہے۔'' وہ نقاہت بھرے انداز میں بولا۔ ''کل صبح ہی سے طبیعت ٹھیک نہیں۔ رات کو معاملہ زیادہ بگڑ گیا تھا۔ حکیم صاحب کوئی دو گھنٹے تک ادھر میرے پاس ہی بیٹھے رہے تھے۔ دل کا مرض بڑے چودھری صاحب یعنی میرے ابا جی چودھری حمید اللہ کو بھی تھا..... اور اسی دل کی بے وفائی نے ان کی جان لی تھی۔ پتا نہیں، اپنی باری کب آتی ہے.....!''

''چودھری صاحب! مایوسی کو دانش مند لوگ بڑے گناہوں میں شمار کرتے ہیں۔'' میں نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ ہمت نہ ہاریں۔ ان شاء اللہ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''چودھری صاحب! جب آپ کی طبیعت اتنی زیادہ خراب تھی بلکہ..... خراب ہے تو پھر آپ آج صبح ملنگ بابا کی لاش کو دیکھنے جائے وقوعہ پر کیوں پہنچ گئے تھے؟''

''بس جی، میں بے اختیار ہو گیا تھا۔'' وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ ''جیسے ہی مجھے پتا چلا کہ ملنگ بابا کا انتقال ہو گیا ہے، میں اپنی بیماری کو بھول کر ادھر پیپل کے درخت کے نیچے پہنچ گیا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں ملنگ بابا کا کتنا احترام کرتا تھا.....!'' بولتے بولتے وہ کھو سا گیا۔

''مجھے کچھ کچھ اندازہ تو ہے چودھری صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات میں جان چکا ہوں کہ آپ ملنگ بابا سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔''

''ملنگ بابا میرے لیے کسی بڑے بزرگ کی طرح تھے۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

''بالکل ایک باپ کی طرح۔انہوں نے مجھ پر بڑا کرم کیا ہے بلکہ.....ان کا ایک احسان ایسا ہے جسے میں ساری زندگی نہیں بھلا سکوں گا۔وہ بہت ہی پہنچے ہوئے اور اللہ سے قریب تھے۔''

مجھے کرید نے اکسایا اور میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔''ایسا کون سا احسان ہے چودھری صاحب؟''

جواب دینے سے پہلے چودھری وحید نے چونک کر میرے عقب میں دیکھا اور تحکمانہ انداز میں کہا۔''ہاں.....لے آؤ منظورے.....!''

میرا رُوئے سخن چودھری کی جانب تھا جبکہ پشت بیڈروم کے داخلی دروازے کی طرف۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دقت محسوس نہ ہوئی کہ اس نے میرے پیچھے کھڑے کسی منظور کو مخاطب کیا تھا۔ میں نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا تو ایک ملازم صورت شخص، ناشتے سے لدی پھندی ایک ٹرے اٹھائے دکھائی دیا۔آئندہ دو منٹ کے اندر اس ''منظورے'' نے میرے سامنے ایک میز رکھ کر اس ٹرے کو سجا دیا۔اسی لمحے چودھری نے منظور کو واپس جانے کا اشارہ کر دیا۔وہ اللہ کا بندہ اور چودھری کا ملازم الٹے قدموں بیڈروم سے نکل گیا۔

چودھری نے اشیائے خورد و نوش کے اوپر سے کپڑا ہٹایا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔''بسم اللہ کریں جناب!''

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی چودھری صاحب!''میں نے وسیع اور اشتہا انگیز کھانوں سے سجے ''دسترخوان'' کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔''میں نے بڑا ٹائٹ ناشتا کر رکھا ہے.....!''

''ملک صاحب! آپ نے ٹائٹ ناشتا کیا ہے یا ڈھیلا ڈھالا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا جناب۔''وہ میرے لیے کھانے کا سامان پلیٹ میں منتقل کرتے ہوئے بولا۔''آپ سے دعا سلام اور جان پہچان تو کافی عرصے سے ہے لیکن آج پہلی مرتبہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کچھ کھائے پیے بنا ہی چلے جائیں۔''

''حاجت تو نہیں ہے چودھری صاحب!''میں نے کھانے کی پلیٹ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔''لیکن آپ جتنی محبت سے اصرار کر رہے ہیں، میں انکار نہیں کر سکوں گا۔''

''یہ آپ میری عزت افزائی کر رہے ہیں ملک صاحب!''وہ تشکر آمیز انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔''آپ بھی لیں نا.....؟''

''میں اب لینے کے قابل کب رہا ہوں جناب!'' وہ حسرت بھرے لہجے میں بولا۔
''حکیم صاحب نے مرغی اور مرغن غذاؤں پر مکمل پابندی لگا دی ہے۔ آج کل سب کچھ پرہیزی چل رہا ہے۔''

چودھری وحید اللہ کے محبت سے معمور اصرار کو دیکھتے ہوئے ضرورت نہ ہونے کے باوجود بھی میں نے ''بسم اللہ'' کر دی۔ اس دوران میں ہمارے درمیان ہلکی پھلکی بات چیت بھی جاری تھی۔ میں نے چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''چودھری صاحب! ملنگ بابا کی موت پر آپ نے پولیس کو بلانے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟''

''میں اطلاع ملنے پر جب صبح بابا کو دیکھنے گیا تو مجھے ان کے ہونٹوں پر خون نظر آیا تھا جو ان کی ڈاڑھی کے بالوں کو بھی بھگو رہا تھا۔'' وہ ایک تکیے سے ٹیک لگانے کے بعد گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس سے مجھے شک ہوا اور میں نے بابا کی تدفین کے انتظامات رکوا کر دو بندے آپ کی طرف دوڑا دیے.....''

''میں آپ کے بندوں کی اطلاع پر ہی پہنچا ہوں چودھری صاحب۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر پوچھا۔ ''ملنگ بابا کی لاش کو دیکھ کر آپ کو کس قسم کا شک ہوا تھا؟''

''میں سمجھتا ہوں.....!'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''ملنگ بابا کی موت قدرتی نہیں.....اور ہونٹوں سے نکلنے والا کون کوئی اور ہی کہانی سنا رہا ہے.....میرے خیال میں، کسی ظالم انسان نے کوئی زہریلی شے کھلا کر ملنگ بابا کو ہلاک کیا ہے.....''

''میرا ذہن بھی کچھ اسی انداز میں سوچ رہا ہے چودھری صاحب!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''زہر خورانی کے باعث عموماً ایسی موت واقع ہوتی ہے۔ بہرحال، میں نے ملنگ جی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوا دیا ہے، ایک آدھ دن میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔''

وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تو یہ بتائے گی نا کہ ملنگ جی کی موت طبعی ہوئی ہے یا انہیں زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔ اگر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ واقعی انہیں کسی سازش کے تحت قتل کیا گیا ہے تو پھر یہ پتا کیسے چلے گا کہ ان کا قاتل کون

ہے.....؟''

''یہ پتا چلانا کہ ملنگ بابا کو کس نے قتل کیا ہے، میری ذمے داری بنتی ہے چودھری صاحب!'' میں نے پُر اعتماد انداز میں کہا۔ ''اور میں یہ ذمے داری آپ کے تعاون اور مدد سے پوری کروں گا۔''

''میں.....میں بھلا اس سلسلے میں آپ کی.....کیا مدد کر سکتا ہوں.....؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''چودھری صاحب! آپ خوامخواہ پریشان نہ ہوں۔ میں جانتا ہوں، آپ کو دل کی تکلیف ہے۔ میں آپ سے دوڑنے بھاگنے کے کام ہرگز نہیں لوں گا.....!''

''پھر.....'' وہ قدرے سنبھلے ہوئے انداز میں بولا۔ ''پھر میں آپ کی مدد کیسے کروں گا؟''

''درست معلومات فراہم کر کے.....!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

وہ مستفسر ہوا۔ ''مثلاً کس قسم کی معلومات ملک صاحب؟''

''آپ ملنگ بابا کے سب سے بڑی عقیدت مند تھے.....!''

''تھے نہیں جناب.....''ہیں'' کہیں!'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''ملنگ بابا کی موت کا جتنا دکھ مجھے ہوا ہے اتنا کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ آپ یقین جانیں کہ.....''

''مجھے پکا یقین ہے چودھری صاحب!'' میں نے اس کے ادھورے جملے کے جواب میں کہا۔ ''میں ملنگ بابا سے آپ کی جذباتی وابستگی کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جناب.....اور اسی لیے میں دس بندوں سے پوچھنے کے بجائے صرف آپ ہی سے سوال جواب کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں، ملنگ بابا کو آپ سے زیادہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''خیر سے، اپنے ملنگ بابا کا نام کیا تھا؟''

''نام.....!'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''ان کا نام تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ سب

انہیں ''ملنگ بابا'' یا صرف ''ملنگ جی'' کہا کرتے تھے۔''

''چودھری صاحب! اور کسی کو ملنگ بابا کا نام معلوم ہو یا نہ ہو لیکن آپ کو تو پتا ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے کھانے پینے کی اشیا سے انصاف کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ ملنگ بابا سے بہت قریب تھے، آپ کی لاعلمی مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔''

''وہ بات دراصل یہ ہے جناب کہ میں نے ان سے کبھی نام پوچھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔'' وہ وضاحتی انداز میں بولا۔ ''اور اس کی بھی ایک خاص وجہ تھی۔''

''کیا وجہ تھی چودھری صاحب؟'' میں نے پوچھ تاچھ کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے بتایا۔ ''ملنگ بابا ہر وقت خاموش رہتے تھے۔ کسی نے انہیں کبھی بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اس خیال سے ان کا نام پوچھنے کی ہمت نہیں کی کہ وہ بولتے تو ہیں نہیں، میرے سوال پر وہ کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ ویسے بھی میں ان کا نام جان کر کیا کرتا۔ وہ اشاروں کی زبان میں مجھ سے ''گفتگو'' کر لیا کرتے تھے اور ضرورت پڑنے پر میری روحانی مدد کر دیا کرتے تھے۔ میں بس، اسی میں خوش تھا۔''

''آپ کی طرح اور بھی کوئی شخص ملنگ بابا کے نام سے واقف نہیں۔'' میں نے کھانے کے حوالے سے انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ ملنگ بابا کہاں سے آیا تھا اور اس نے پیپل کے درخت کے نیچے ڈیرا کیوں لگا لیا تھا۔ اس گاؤں میں اسے ایسی کیا خاص بات نظر آئی کہ اس کے قدم آگے نہیں بڑھے۔ اوروں کی بات چھوڑیں چودھری صاحب.....!'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ تو ملنگ بابا کے بہت قریب تھے۔ آپ کو یہ ساری باتیں یا ان میں سے زیادہ تر تو پتا ہونا چاہیے نا؟''

''آپ یقین کریں ملک صاحب! یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں کہ ملنگ بابا صورت نگر آنے سے پہلے کہاں رہتے تھے؟'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''البتہ، اتنا جانتا ہوں کہ انہیں یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ میرے خیال میں وہ اسی سال پھگن (پھاگن) میں آئے تھے.....!''

''ملنگ بابا پھگن میں یہاں آیا تھا اور آج کل بھادوں کا آغاز ہے۔'' میں نے سوچ

میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔''اس کا مطلب ہے ملنگ بابا کو صورت نگر میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا.....یہی کوئی پانچ چھ ماہ.....؟''

دیسی مہینا پھاگن عرف پھگن ماہ فروری کے وسط سے شروع ہو جاتا ہے اور ان دنوں بھادوں کا پہلا ہفتہ تھا یعنی ماہ اگست کی انیس یا بیس تاریخ۔ چودھری نے میرے قیاس کے جواب میں سر کو اثباتی جنبش دی اور بولا۔

''جی ہاں.....آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اتنا عرصہ ہی ہوا تھا.....!''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔''یہ ٹھیک ہے چودھری صاحب کہ انسان بغیر بات چیت کیے تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن وہ کھانا پینا تو بہر حال نہیں چھوڑ سکتا نا.....ملنگ بابا کے کھانے پینے کا کیا بندوبست تھا اس پیپل کے نیچے؟''

''یہ آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے ملک صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔''میں اگر چاہتا تو ملنگ بابا کو اپنی حویلی میں بڑے آرام سے رکھ سکتا تھا۔ وہ اس شان اور مرتبے والے تھے کہ انہیں سر آنکھوں پر بٹھا کر خدمت کرنا چاہیے تھی، میری دلی خواہش بھی یہی تھی لیکن ابتدا میں جب میں نے ایسا کرنا چاہا تو ملنگ بابا نے اشاروں کی زبان میں مجھے اس کام سے روک دیا اور وہ اس بات پر مُصر رہے کہ پیپل کے نیچے ہی وہ آرام سے ہیں، میں نے ضد نہیں کی اور.....''

''چودھری صاحب!'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔''میں ملنگ بابا کے کھانے پینے کے بارے میں پوچھ رہا تھا؟''

''جی ہاں.....جی ہاں.....'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''میں آپ کو وہی بتانے والا تھا.....''

''تو بتائیں پھر؟''

وہ بولا۔''یہ ٹھیک ہے کہ میں ملنگ بابا کے بہت قریب تھا۔ ان سے مجھے گہری عقیدت تھی لیکن میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی ان کے دیوانے تھے۔ ملنگ بابا نے سب کو کچھ نہ کچھ دیا ہی تھا، کسی سے بھی کوئی تقاضا نہیں کیا۔ گاؤں کے سب ہی جوان ملنگ بابا کی خدمت کو ایک سعادت سمجھتے تھے لہٰذا اس صورتِ حال میں، میں نے ایک فیصلہ کیا اور اپنے اس فیصلے سے گاؤں والوں کو آگاہ بھی کر دیا۔''

وہ سانس درست کرنے کے لیے تھما تو میں نے پوچھ لیا۔ ''کیسا فیصلہ چودھری صاحب؟''

''میں نے سب پر واضح کر دیا کہ رات کا کھانا ملنگ بابا میرے ہاں سے کھائیں گے۔ مطلب یہ کہ ملنگ بابا کے لیے رات کا کھانا میری حویلی سے جائے گا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''باقی صبح اور دوپہر میں جو بھی ان کی خدمت خاطر کرنا چاہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ملنگ بابا کوئی میری ذاتی جائداد کی طرح تو تھے نہیں۔ گاؤں والوں کا بھی ان پر اتنا ہی حق تھا، جتنا کہ میرا۔ میں ملنگ بابا کے لیے ان کی محبت اور عقیدت کو سمجھتا تھا جناب..... تو ملنگ بابا کے کھانے پینے کا بندوبست اس طرح ہو رہا تھا جناب.....!''

چودھری کے خاموش ہونے پر میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''تو ملنگ بابا کے لیے رات کا کھانا باقاعدگی کے ساتھ آپ کی حویلی سے جایا کرتا تھا.....؟''

''جی ہاں..... بالکل.....!'' وہ پہلو بدلتے ہوئے نقاہت آمیز لیکن اٹل لہجے میں بولا۔

اس وقت میرا ذہن ایک خاص زاویے پر بڑی تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ''چودھری صاحب! ملنگ بابا تک رات کا کھانا کون پہنچایا کرتا تھا؟''

''ان کے لیے میرا ایک ملازم کھانا لے کر جاتا تھا۔'' چودھری نے بتایا۔

''کیا روزانہ ایک ہی ملازم یہ ڈیوٹی دیتا تھا یا کوئی بھی بندہ چلا جایا کرتا تھا؟''

''اس کام کے لیے میرا ایک ہی ملازم مخصوص تھا جناب۔'' چودھری نے جواب دیا۔

''اس بندے کا نام رمضان عرف رمضو ہے۔ رمضو میرے بھروسے کا آدمی ہے ملک صاحب!''

بات ختم کر کے چودھری وحید اللہ نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے اس نے میری مخصوص سوچ پڑھ لی ہو۔ اس کی آنکھوں میں بھی یہی سوال تھا کہ کیا میں اسی حوالے سے شک کر رہا ہوں۔ میں نے چودھری کی ''تسلی'' کے لیے تصدیقی انداز میں کہا۔

''آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کس انداز میں سوچ رہا ہوں؟''

''جی ہاں، آپ کا انداز سمجھ میں آ رہا ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''آپ کو رمضو پر شک ہو رہا ہے نا.....؟''

''اس شک کی ایک ٹھوس وجہ ہے نا چودھری صاحب!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور

دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو آپ بھی مان رہے ہیں کہ ملنگ بابا کی موت طبعی انداز میں نہیں ہوئی اسی لیے آپ نے دو بندے میری جانب دوڑائے تھے۔ میں آپ کے اس دور اندیشانہ اقدام کی دل سے قدر کرتا ہوں چودھری صاحب.....'' میں لمحے بھر کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ملنگ بابا کے ہونٹوں پر موجود خون بہ زبان خاموشی یہ کہانی سناتا ہے کہ انہیں زہریلی شے کھلا کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اور زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ زہر رات کے کھانے میں موجود ہوگا..... میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟''

''آپ کے سوچنے کا انداز بالکل درست ہے ملک صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''لیکن میں آپ سے یہاں تھوڑا اختلاف کروں گا۔''

''کیسا اختلاف چودھری صاحب؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بتانے لگا۔ ''میری حویلی سے ملنگ بابا کے لیے رات کا جو کھانا بھیجا جاتا تھا وہ سورج غروب ہونے سے پہلے رمضو ان تک پہنچا دیا کرتا تھا یعنی اندھیرا ہونے سے قبل.....!''

''تو.....'' میں نے متذبذب انداز میں پوچھا۔ ''اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟''

''اس سے یہ ثابت ہوتا ہے ملک صاحب.....!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا کہ اگر بالفرض محال، ملنگ بابا کی موت میری حویلی سے جانے والے کھانے سے واقع ہوئی ہے تو ان کی موت کا وقت رات کے پہلے حصے کا ہونا چاہیے جبکہ ان کے ہونٹوں پر پائے جانے والے خون کی حالت سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کی موت رات کے آخری حصے میں ہوئی ہوگی۔ آپ نے ان کی لاش کا تفصیلی معائنہ کیا ہے۔ یہ بات تو آپ بھی تسلیم کریں گے جناب.....!''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور گمبھیر انداز میں کہا۔ ''موت کا بالکل درست وقت تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے سامنے آجائے گا چودھری صاحب لیکن میرا اندازہ بھی یہی ہے کہ ملنگ بابا کی موت نصف شب کے بعد کسی وقت واقع ہوئی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ مجھ سے مکمل اتفاق کرتے ہیں؟'' وہ قدرے خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''مکمل نہیں جناب۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کسی حد تک!''

''کسی حد تک.....'' اس نے آنکھیں پھیلائیں۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں ملک صاحب!''

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں اس حوالے سے آپ کا ہم خیال ضرور ہوں کہ ملنگ بابا کی موت رات کے آخری حصے میں واقع ہوئی ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کی موت، آپ کی حویلی سے جانے والے کھانے سے نہیں ہوئی۔ یہ بھی تو ممکن ہے، ملنگ بابا نے کھانا لے کر اپنے پاس رکھ لیا ہو اور رات کو دیر سے کسی وقت کھایا ہو.....؟''

''یہ ممکن نہیں ملک صاحب!'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا ممکن نہیں ہے؟''

میرے سوال کے جواب میں اس نے الٹا مجھ سے پوچھ لیا۔ ''کیا آپ کو جائے وقوعہ سے کھانے پینے کا کوئی برتن وغیرہ ملا ہے؟''

''نہیں.....'' میں نے متعجب نظر سے اسے دیکھا۔ ''کھانے کے برتنوں کا میرے سوال سے کیا تعلق؟''

''بڑا گہرا تعلق ہے ملک صاحب!'' وہ پُراسرار لہجے میں بولا۔ ''ملنگ بابا کی ایک خاص عادت تھی۔ جو بھی ان کے لیے کھانا لے کر جاتا۔ وہ اسے وہیں رکنے کا اشارہ کرتے تھے۔ پھر اسی وقت جتنا کھانا ہوتا تھا، وہ کھا کر برتن واپس کر دیا کرتے تھے۔ کسی کا برتن بھانڈا اپنے پاس رکھنا انہیں پسند نہیں تھا اسی لیے.....'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا، ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اسی لیے مجھے یقین ہے کہ ملنگ بابا نے میری حویلی سے جانے والا کھانا سرِ شام ہی کھا لیا تھا۔ رمضو اس وقت تک ملنگ بابا کے پاس ہی بیٹھا رہا تھا جب تک انہوں نے کھانا ختم کرنے کے بعد دعا نہیں کی۔''

''دعا.....؟'' میں نے سوالیہ نظر سے چودھری وحید اللہ کی طرف دیکھا۔

''جی ملک صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کھانے کے اختتام پر ملنگ بابا اس شخص کے حق میں دعا کرتے تھے جو ان کے لیے کھانا لے کر آیا ہو یا جس نے وہ کھانا بھجوایا ہو۔ گزشتہ رات بھی یہی ہوا تھا۔ جب رمضو کھانے والے برتن لے کر حویلی پہنچا تو اس وقت تک اندھیرا ابھی پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ میں نے رمضو سے بڑی کڑی پوچھ گچھ کی ہے جناب۔ وہ میرے بھروسے کا آدمی ہے.....اس نے کبھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔''

''ہوں!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ملنگ بابا کی موت کی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے میں بڑی معاون ثابت ہوگی اور اس سے یہ بھی پتا چل جائے گا کہ اسے کس قسم کے زہر سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی کھل کر سامنے آ جائے گی کہ وہ زہر کب اس کے معدے میں اترا تھا۔ بہر حال.....''

میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ٹٹولنے والی نظر سے چودھری وحید اللہ کو دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔

''آپ کوئی خاص بات سوچ رہے ہیں ملک صاحب؟''

''ہاں!'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دینے کے بعد کہا۔ ''آپ نے تو رمضان عرف رمضو سے کڑی پوچھ گچھ کر لی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ میں بھی اس کا ایک چھوٹا سا انٹرویو کر لوں؟''

''ضرور.....ضرور.....'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''لیکن اس کام کے لیے آپ کو کل تک انتظار کرنا پڑے گا۔''

''کل تک انتظار کیوں.....؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ دراصل، بات یہ ہے جناب.....'' چودھری نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''رمضو کو آج میں نے امین آباد بھیجا ہے۔ اس کی واپسی کل دوپہر تک ہوگی۔''

''امین آباد'' نامی وہ چھوٹا سا گاؤں صورت نگر سے کوئی دس میل دور مشرقی سمت میں واقع تھا۔ یہ موضع بھی میرے تھانے کی حدود ہی میں آتا تھا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''چودھری صاحب! خیریت تو ہے نا۔ رمضو کو صبح ہی صبح آپ نے امین آباد کیوں روانہ کر دیا؟''

''ادھر امین آباد میں میری چھوٹی بہن بیاہی ہوئی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے رمضو کو اپنی بہن زبیدہ بیگم کے پاس بھیجا ہے۔ زبیدہ اور اس کے شوہر، چودھری دلدار کے لیے میں نے چند تحائف بھیجے ہیں۔ فکر والی کوئی بات نہیں جناب.....ادھر سب امن و امان ہے۔''

''آپ کہتے ہیں، فکر والی کوئی بات نہیں تو میں امین آباد کی طرف سے واقعی بے فکر ہو جاتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن یہاں صورت نگر میں چونکہ خیریت نہیں اس لیے

مجھے آپ کا بھرپور تعاون درکار ہے.....!''

''جناب! رمضو جیسے ہی امین آباد سے واپس آئے گا، میں اسے سیدھا آپ کے پاس تھانے بھیج دوں گا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کوئی اور خدمت ہو تو حکم کریں؟''

''چودھری صاحب! ملنگ بابا کی موت کے حوالے سے آپ کے علم میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی آجائے تو آپ فوراً مجھے بتائیں گے؟''

''بے شک جناب۔'' وہ مضبوط انداز میں بولا۔ ''ملنگ بابا کی موت کا جتنا دکھ مجھے ہے اور کسی کو نہیں ہوسکتا۔ میری پہلی اور آخری خواہش یہی ہے کہ ان کا قاتل جلد از جلد قانون کی گرفت میں ہو اسی لیے.....'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک تھکی ہوئی سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اسی لیے میں نے ملنگ بابا کی فوری تدفین روک کر آپ کو تفتیش کے لیے یہاں بلایا ہے۔ میں ان کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچتا دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ چودھری صاحب.....!'' میں نے صدقِ دل سے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

✠ ✠ ✠

اصل کہانی تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد ہی کھلنا تھی لیکن ایک بات کے لیے میں بڑا پُر یقین تھا کہ ملنگ بابا کی موت کسی زہریلی شے کے استعمال سے واقع ہوئی تھی۔ ہونٹوں کے گوشے میں پائے جانے والے خون کے علاوہ ملنگ کے چہرے کی رنگت بھی اسی جانب اشارہ کرتی تھی۔ چودھری وحید کا بھی یہی خیال تھا کہ ملنگ بابا کی موت طبعی نہیں جب ہی اس نے پولیس کو بلوایا تھا لیکن اب ذہن میں سب سے خطرناک سوال یہ ابھر رہا تھا کہ ملنگ بابا کی جان کا دشمن کون تھا۔ ایسا شخص کون تھا جس نے زہر دے کر ملنگ کو موت کے گھاٹ اتارا ہو.....؟

یہ سوال اس لیے بھی ذہنی الجھن اور تشویش کا باعث تھا کہ وہاں ملنگ بابا کا کوئی دشمن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے جن جن لوگوں سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کی تھی ان کے بیانات کے مطابق، صورت نگر کا ہر پیر و جوان ملنگ بابا کی بڑی عزت کرتا تھا اور اس سے گہری عقیدت رکھتا تھا

مگر میں کسی بھی قیمت پر اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ ملنگ کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ملنگ بابا کا قاتل صورت نگر میں موجود تھا اور یہ بات بھی طے تھی کہ قاتل، ملنگ بابا سے شدید نفرت کرتا ہوگا۔

مجھے صورت نگر کے اندر ہی سے قاتل کو تلاش کرنا تھا۔

محبت اور نفرت اس کائنات کے بڑے طاقتور جذبے ہیں۔ یہ اگر شدت اختیار کر جائیں تو ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔ محبت اگر زندگی دیتی ہے تو نفرت جان لینے میں کسی پس و پیش سے کام نہیں لیتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ صورت نگر میں ملنگ کو چاہنے والوں، اس سے محبت کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آ رہی تھی کہ انہی عقیدت مندوں کے درمیان کسی کو ملنگ سے شدید ترین نفرت بھی تھی..... ایسی شدید نفرت کہ اس نے ملنگ کی جان لے لی تھی۔

انسان جب کسی مسئلے پر سوچنا شروع کرتا ہے تو نئی نئی راہیں کھل کر سامنے آنے لگتی ہیں۔ ان لمحات میں، میں بھی ''ملنگ مرڈر کیس'' پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔ میرا ذہن کسی معمولی سے معمولی بات کو بھی نظر انداز کرنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ بات تو بالکل واضح تھی کہ ملنگ بابا کے جسم میں اترنے والا زہر کھانے کے ذریعے اس کے معدے تک پہنچا تھا یعنی اس کا جو کوئی بھی دشمن تھا اسی کی جانب سے ملنگ کے لیے کھانا گیا ہوگا.....!

اس نکتے سے آپوں آپ دھیان چودھری وحید اللہ کی طرف چلا جاتا تھا۔ ملنگ بابا کے لیے رات کا کھانا اسی کی حویلی سے جاتا تھا اور اس کے بعد ملنگ بابا صبح تک کچھ نہیں کھاتا تھا۔ لیکن اس نکتے پر غور کرتے ہوئے ذہن الجھ کر رہ جاتا تھا۔ دماغ میں یہ سوچ آتی تھی کہ اگر ملنگ کی ہلاکت میں چودھری وحید اللہ کسی بھی طور پر ملوث ہے تو پھر اس نے پولیس کو بلانے اور ملنگ کی موت کی تفتیش کرانے کا کھٹ راگ کیوں پھیلایا؟ وہ سیدھا سیدھا ملنگ کو نارمل انداز میں دفن ہو جانے دیتا۔ اس طرح اس کا جرم بڑی آسانی سے چھپ سکتا تھا لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا بلکہ معاملے کی چھان بین کے لیے پولیس کو بلوا لیا تھا۔ میری طرح اسے بھی یقین تھا کہ ملنگ بابا کی موت طبعی انداز میں واقع نہیں ہوئی۔ میں نے چودھری سے ملاقات کے دوران میں گھما پھرا کر تقریباً ہر زاویے سے سوال کیے تھے اور اس کے نتیجے میں میری ذاتی رائے یہ تھی کہ چودھری وحید اللہ

ملنگ بابا کے قتل میں کسی بھی طور ملوث نہیں تھا! میں ایک بات کا ذکر کرنا بھول گیا کہ چودھری وحید سے ملاقات کے دوران میں، میں نے اس سے ان برتنوں کے بارے میں بھی پوچھا تھا جن میں گزشتہ رات ملنگ بابا کو کھانا دیا گیا تھا۔ میں ان برتنوں کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھجوانا چاہتا تھا لیکن مجھے پتا چلا کہ حویلی کی ملازمائیں رات کو سونے سے پہلے تمام برتن بھانڈے دھو دیا کرتی تھیں۔

اب نمبر آتا تھا، رمضان عرف رمضو کا۔ رمضو کی یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ روزانہ رات کا کھانا ملنگ بابا تک پہنچایا کرتا تھا۔ اس بات کے امکانات بہرحال تھے کہ ملنگ بابا کا کھانا حویلی سے صاف شفاف اور انتہائی صحت افزا چلا ہو لیکن راستے میں رمضو نے اسے کسی خاص مقصد کے تحت زہریلا بنا دیا ہو.....اگر ایسا ہی تھا تو اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ رمضو اپنے دل میں ملنگ کے لیے گہرا عناد رکھتا تھا۔ اس عناد کا سبب کیا تھا، یہ تو رمضو کا انٹرویو کرنے کے بعد ہی معلوم کیا جا سکتا تھا اور .....اس رمضو کا ''انٹرویو'' کل دوپہر کے بعد ہی کیا جا سکتا تھا کیونکہ چودھری وحید نے رمضو کی امین آباد سے واپسی کے بارے میں یہی بتایا تھا۔

قاتل کے حوالے سے اس کیس کا تیسرا پہلو یہ تھا کہ ملنگ بابا کی جان لینے والے کا تعلق چودھری کی حویلی سے نہ ہو بلکہ وہ گاؤں کا کوئی اور باسی ہو لیکن اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں ڈھونڈی جا سکتی تھی کہ نامعلوم قاتل کے پاس ملنگ بابا کو قتل کرنے کا کوئی حتمی جواز رہا ہوگا۔

اسی سوچ بچار کے دوران میں، میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ مجھے جائے وقوعہ سے گاؤں تک کا کُھرا اٹھانا چاہیے۔ اس طرح تفتیش کے دائرے کو بہ آسانی محدود کیا جا سکتا تھا۔ میں اس کُھرے کی مدد سے یہ جاننے میں کامیاب ہو جاتا کہ گزشتہ روز گاؤں کے اندر سے پیپل کے درخت تک اور پیپل کے درخت سے گاؤں تک کون کون گیا تھا۔ یہ اتنا آسان کام تو نہیں تھا جیسا بیان کرنے سے محسوس ہوتا ہے لیکن فوری طور پر اس کا سہارا لینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے کُھرے کے خیال کے ساتھ ہی کانسٹیبل عمر دین کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی اسپتال سے لوٹا تھا۔ میں نے جائے وقوعہ سے عمر دین کو لاش کے ساتھ سرکاری اسپتال بھیج دیا تھا۔

عمر دین میرے سامنے آ کر بیٹھ چکا تو میں نے پوچھا۔ ''ہمارے پاس ایک کھوجی

ہے.....مبارک حسین۔ وہ اس وقت کہاں مل سکتا ہے؟''

''چاچا مبارک اپنے گھر ہی میں ہوگا جناب۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔''کوئی کام ہوتو میں ابھی اسے بلالاتا ہوں۔''

''کام تو ہے عمر دین!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''لیکن تمہارے ترت جواب سے محسوس کر رہا ہوں کہ تمہیں مبارک حسین کو بلانے سے زیادہ خوشی اپنے گھر والوں سے ملنے کی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں جناب! آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں اور یہ تو ایک قدرتی بات ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''یہ کیسے ممکن ہے کہ میں مرشد آباد جاؤں اور اپنے بیوی بچوں سے نہ ملوں۔ ویسے وہاں جانے کا اصل مقصد چاچا مبارک کو بلا کر لانا ہی ہوگا۔''

موضع مرشد آباد میرے تھانے سے لگ بھگ ڈھائی میل کے فاصلے پر جنوبی سمت سے واقع تھا یعنی نہر کے کنارے سے کوئی آدھا میل دور لیکن یہ تھانے سے نہر کی طرف جانے والے رستے سے تھوڑا سا ہٹ کر تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ مرشد آباد میں کانسٹیبل عمر دین کا گھر تھا اور کھوجی بابا مبارک حسین کی رہائش بھی وہیں پر تھی۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے عمر دین سے کہا۔

''تو ٹھیک ہے، تم فوراً مرشد آباد روانہ ہو جاؤ اور جتنی جلدی ممکن ہو سکے، کھوجی کو اپنے ساتھ لے کر میرے پاس آ جاؤ۔''

''آپ یقیناً ملنگ بابا کے سلسلے میں کھرا وغیرہ نکلوانا چاہتے ہیں۔'' وہ سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہارا اندازہ ابالکل درست ہے عمر دین۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کل دن میں.....خصوصاً دوپہر سے شام تک گاؤں کے اندر سے ملنگ بابا تک کون کون آیا تھا۔ یہ بات تو تمہارے علم میں آ چکی ہے نا کہ ملنگ بابا کی موت قطعاً طبعی نہیں۔ تم جائے وقوعہ کے معائنے کے دوران میں میرے ساتھ ہی تھے۔''

''جی ملک صاحب۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔''ملنگ بابا کی لاش سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ باقی حقیقت پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد ہی کھل کر سامنے آئے گی۔''

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے چودھری وحید اللہ سے ہونے والی گفتگو کے

بارے میں بتایا اور آخر میں کہا۔ ''اب تو تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے کہ میں کھوجی مبارک کو بلا کر کھرا کیوں اٹھوانا چاہتا ہوں؟''

''جی..... جی ہاں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا پھر اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''میں ابھی جاتا ہوں جناب اور اگر اللہ نے چاہا تو گھنٹے، دو گھنٹے بعد میں چاچا مبارک کو اپنے ساتھ لے کر آپ کے سامنے حاضر ہو جاؤں گا۔''

میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

عمر دین نے گھنٹے، دو گھنٹے بعد واپسی کی بات کی تھی لیکن ابھی اسے میرے کمرے سے رخصت ہوئے صرف پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ وہ دوبارہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔

''کیا ہوا عمر دین؟'' میں نے اس کی حالت کے پیشِ نظر پوچھ لیا۔

وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! مرشد آباد جانے کا اب کوئی فائدہ نہیں رہا.....!''

''اب کوئی فائدہ نہیں رہا..... کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں اس کی بات سن کر چونک اٹھا۔ ''ایسا کیا ہو گیا ہے عمر دین.....؟''

''جناب..... باہر بارش ہو رہی ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''اوہ میرے خدایا.....!'' بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔

عمر دین کا اندازہ بالکل درست تھا۔ بارش ہو جانے کے سبب تمام کا تمام کھرا صفحۂ دھرتی سے نیست و نابود ہو جاتا تھا پھر کسی کھوجی کو بلانے کا کوئی جواز تھا اور نہ ہی کھرا وغیرہ اٹھانے سے کوئی فائدہ حاصل ہونے والا تھا۔ بھادوں کا مہینا ایسا ہی ستم ظریف ہوتا ہے، کچھ پتا نہیں چلتا کس لمحے آسمان رونا شروع کر دے۔ اِدھر دھوپ اُدھر بارش اور تھوڑے ہی دیر کے بعد سب صاف۔ عمر دین کی مایوسی میری سمجھ میں آئی تو میں نے اس سے کہا۔

''آؤ بیٹھو..... اب واقعی کچھ نہیں ہو سکتا۔''

ہمارے درمیان ملنگ بابا کی موت کے حوالے سے گفتگو ہونے لگی۔ ساون اور بھادوں کی برسات کا ذکر آیا تو میرے ذہن میں ایک اچھوتا سوال ابھرا۔ مجھے اس بات پر حیرت بھی ہوئی

کہ میں نے پہلے اس انداز میں کیوں نہیں سوچا۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے کانسٹیبل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''عمر دین.....کیا تمہارے علم میں یہ بات تھی کہ صورت نگر میں پیپل کے درخت کے نیچے کوئی ملنگ بابا پچھلے چھ ماہ سے دھرنا دیے بیٹھا ہے؟''

''جی ہاں.....!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''مجھے ملنگ بابا کی موجودی کے بارے میں خبر تھی۔ میری معلومات کے مطابق، وہ فروری کے مہینے میں وہاں آیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے صورت نگر والوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ میری تو عقل میں نہیں آ رہا کہ وہاں ایسا کون شخص اس کا دشمن ہوسکتا ہے.....؟''

میں نے اس کی ذہنی الجھن پر توجہ دیے بغیر خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ''وہ ملنگ فروری سے صورت نگر میں موجود تھا اور اب اگست ختم ہونے والا ہے۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ ملنگ بابا نے موسم برسات کا مقابلہ کس طرح کیا ہوگا؟''

''جی.....!'' اس نے متذبذب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''میں سمجھا نہیں ملک صاحب؟''

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''وسط جولائی سے ساون کا مہینا شروع ہو جاتا ہے اور آج کل بھادوں کا پہلا ہفتہ چل رہا ہے۔ ساون بھادوں برسات کے مہینے ہیں اور اس سال تو برسات بھی خوب جھوم کر آئی ہے۔ دیکھ لو، اس وقت بھی باہر دھواں دھار بارش ہو رہی ہے۔'' میں نے چند لمحات توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے دیکھا تو نہیں مگر سننے میں یہی آیا ہے کہ ملنگ بابا چوبیس گھنٹے پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھا رہتا تھا۔''

''کیا وہ چھم چھم برستی بارش میں بھی پیپل کے پیڑ کے نیچے دھرنا دیے بیٹھا رہتا تھا۔ اگر ایسا تھا تو اس کے گیلے لباس کا کیا ہوا ہوگا؟ بھیگے ہوئے لباس میں اس کی بے بسی کا عالم عقیدت مندوں سے کیسے دیکھا جاتا تھا، خصوصاً چودھری وحید اللہ سے.....وہ تو ملنگ بابا کا بہت ہی پہنچا ہوا مرید تھا۔ اب یہ تو قدرتی طور پر ممکن نہیں کہ ہر طرف بارش ہو اور ملنگ بابا سوکھا ہی بڑے اطمینان سے پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھا رہے.....؟''

''ہاں واقعی، ایسا ممکن نہیں ہے۔'' عمر دین نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ ملنگ بابا برسات سے اپنا بچاؤ کس طرح کرتا تھا۔''

''مجھے بھی بتاؤ؟'' میں دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! آج صبح ہم جائے وقوعہ پر موجود تھے۔ آپ نے دیکھا ہوگا، پیپل کے پیڑ سے چند گز آگے بیری والا کھوہ ہے اور اس کھوہ کے ساتھ ہی ایک کچا کمرا بنا ہوا ہے، نیچی چھت والا یہ چھوٹا سا کمرا کھڑکی دروزے سے آزاد ہے۔''

''ہاں ہاں، میں نے وہ کمرا دیکھا تھا۔'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔ ''اس سے آگے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کمرا کس مقصد کے لیے تعمیر کیا گیا تھا؟''

''کسی زمانے میں وہ کمرا صورت نگر میں ایک مزارع کے استعمال میں تھا۔'' عمر دین نے بتایا۔ ''لیکن پچھلے کچھ عرصے سے وہ یونہی متروک پڑا ہوا ہے۔ برسات کے وقت ملنگ بابا، میری معلومات کے مطابق اسی کمرے میں پناہ لیا کرتا تھا۔''

''ہوں.....!'' میں نے گہری نظر سے اسے دیکھا۔ ''عمر دین لگتا ہے، تم صورت نگر کے حالات سے اچھی خاصی واقفیت رکھتے ہو؟''

''بس جناب، ایسی خبریں تو خود بخود اِدھر اُدھر سفر کرتی رہتی ہیں۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''عمر دین! تمہارے خیال میں ملنگ بابا کی جان کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟''

''میں نے اس سلسلے میں ذہن کو چاروں طرف دوڑایا ہے ملک صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن اس سوال کا جواب تلاش نہیں کر سکا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اتنی جرأت کا مظاہرہ کس نے کیا ہے جبکہ گاؤں کے چودھری صاحب بھی ملنگ کے عقیدت مندوں میں شامل تھے..... بلکہ سب سے آگے تھے۔ آپ یقین کریں جناب، چودھری وحید اللہ ملنگ بابا کا بڑا احترام کرتا تھا۔''

''اس بات کا مجھے بخوبی اندازہ ہو چکا ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے

جواب دیا۔ ''میں چودھری وحید اللہ سے ایک بھرپور ملاقات کر کے آیا ہوں۔ وہ ملنگ بابا کا کسی معاملے میں بہت احسان مند ہے۔''

''کس معاملے میں؟'' عمر دین نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''اس نے کوئی واضح بات تو نہیں کی، بس اتنا کہا تھا..... ملنگ بابا کا مجھ پر ایک اتنا بڑا احسان ہے کہ میں ساری زندگی نہیں بھلا سکوں گا..... میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ ایسا کون سا احسان ہے چودھری صاحب؟ اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کا جواب دیتا، ایک ملازم ناشتے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوا تھا اور ہماری بات ادھوری رہ گئی۔ منظور انامی وہ ملازم جب وہاں سے رخصت ہوا تو ہم دوسری باتوں میں لگ گئے تھے۔ پھر میں چودھری سے، ملنگ بابا کے اس عظیم احسان کے بارے میں پوچھ نہ سکا۔''

''میرا دھیان ایک خاص واقعے کی طرف جا رہا ہے جناب.....!'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا اس واقعے کا تعلق ملنگ بابا کے احسان عظیم سے ہے؟''

''جی ہاں، میں اسی حوالے سے بات کر رہا ہوں۔''

''تفصیلات کیا ہیں؟'' میں ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

وہ بتانے لگا۔ ''چودھری وحید اللہ کی عمر اس وقت پچپن کے قریب ہے۔ اس کی شادی کو لگ بھگ تیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن بدقسمتی سے ابھی تک ان کی اولاد پیدا نہیں ہو سکی تھی.....''

''ابھی تک پیدا نہیں ہو سکی تھی..... کیا مطلب؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

یہ بات تو میرے علم میں تھی کہ چودھری وحید اللہ بے اولاد تھا لیکن کانسٹیبل عمر دین نے اپنے بیان میں ''ابھی تک'' کے جو الفاظ استعمال کیے تھے اس سے میں چونک اٹھا۔ چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ عمر دین کوئی سنسنی خیز انکشاف کرنے جا رہا تھا۔

''میں وہی تو بتانے والا تھا جناب!'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں بولا۔ ''ابھی تک سے میری مراد یہ تھی کہ اب چودھری کے باپ بننے کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔

چودھری کی بیوی فردوس بیگم پچھلے چند ماہ سے امید سے ہے اور یہ سب کچھ ملنگ بابا کے کرم سے ہوا ہے۔ میرا خیال ہے چودھری صاحب نے ملنگ بابا کے اسی احسان کا ذکر کیا ہوگا.....!''

عمر دین کے انکشاف نے میرے پورے وجود میں ایک سنسنی سی دوڑا دی تھی۔ میں نے تیز آواز میں پوچھا۔ ''ملنگ بابا نے چودھرائن پر یہ کرم کس طرح کیا تھا؟''

''سننے میں آیا ہے کہ چودھری صاحب، ملنگ بابا کے پاس اولاد کی دعا کرانے جایا کرتے تھے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، ملنگ بابا نے اشاروں میں چودھری کو کیسے سمجھایا کہ وہ چودھرائن پر خصوصی دم کرے گا۔ چودھری نے درخواست کی کہ ملنگ بابا حویلی میں آ کر فردوس بیگ پر دم کر دیں۔ ملنگ بابا نے اپنے سب سے چہیتے عقیدت مند کی یہ بات مان لی اور باقاعدہ تین روز تک حویلی میں آ کر چودھرائن پر دم کرتا رہا تھا، جس کے نتیجے میں چودھرائن کا پاؤں بھاری ہو گیا۔ اب نئے سال کے پہلے مہینے میں چودھری وحید اللہ باپ بن جائے گا۔''

''تم تو چھپے رستم ہو عمر دین..... بلکہ عالمی جاسوس ہو جو اتنی اندر کی باتیں تمہیں پتا ہیں۔'' میں نے تعریفی نظر سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم یہ بھی جانتے ہو گے، ملنگ بابا نے چودھری وحید کے سامنے چودھرائن پر دم کیا تھا یا تنہائی میں لے جا کر؟''

''دم تو ملنگ بابا نے تنہائی ہی میں کیا تھا جناب۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ تین دن تک، ایک گھنٹے کے لیے چودھرائن کو لے جا کر ایک کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔ دم سے فارغ ہونے کے بعد کمرا کھول دیا جاتا۔ چوتھے روز ملنگ بابا نے اشاروں میں چودھری کو بتایا کہ اس نے اپنی طرف سے کام پکا کر دیا ہے۔ جلد ہی چودھرائن اسے خوش خبری سنائے گی.....اور پھر ایسا ہی ہوا۔'' وہ لمحے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ایک ماہ کے بعد چودھرائن نے چودھری وحید کو واقعی خوش خبری سنا دی۔ چودھری کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ آپ خود سوچیں جناب.....ملنگ بابا نے چودھری کا کتنا بڑا کام کیا تھا۔ چودھری اس کا جتنا بھی احسان مانے کم ہے!''

''میں تم سے تھوڑا اختلاف کروں گا عمر دین۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ملنگ بابا نے چودھری کا نہیں بلکہ چودھرائن کا کام کیا تھا لیکن تم مجھے ایک بات تو بتاؤ.....؟''

''کون سی بات ملک صاحب؟'' وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''عمر دین! کیا تم اس وقت کمرے کے اندر موجود تھے جب ملنگ بابا، چودھرائن پر دم وغیرہ کر رہا تھا؟''

''نہیں جناب، یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''ملنگ بابا نے تو چودھری صاحب کو بھی کمرے میں آنے کی اجازت نہیں دی تھی، میں بھلا وہاں کیسے گھس سکتا تھا؟''

''تم نے جتنی تفصیل سے یہ واقعہ سنایا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے پیش آیا تھا۔ تمہاری معلومات کا ذریعہ کیا ہے عمر دین؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''مجھے یہ ساری باتیں رضیہ نے بتائی ہیں جناب!'' اس نے جواب دیا۔

''رضیہ..... یہ کون ہے؟'' بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔

''رضیہ میری بیوی کا نام ہے ملک صاحب!''

''لیکن.....'' میری الجھن میں اضافہ ہوگیا۔ ''تمہاری بیوی کا اس واقعے سے کیا تعلق؟''

''آپ تو جانتے ہیں ملک صاحب!'' وہ قدرے شرمندگی سے بولا۔ ''یہ عورتیں ہر واقعے کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق نکال ہی لیتی ہیں۔ ملنگ بابا کی مقبولیت اور کرامت کے بارے میں زیادہ تر باتیں مجھے رضیہ ہی نے بتائی تھیں۔''

''کرامت..... یعنی چودھرائن کے امید سے ہونے والا معاملہ؟'' میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا۔

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''لیکن میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا ہوں کہ تمہاری بیوی رضیہ اور ملنگ بابا کے معاملے میں کیا رشتہ ناتا ہے؟'' عمر دین کے انکشاف نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میری تین بیٹیاں ہیں۔ تینوں ہی ایک سے بڑھ کر ایک سمجھدار اور ذہین ہیں۔ میں اپنی تینوں بچیوں سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔ رضیہ بھی انہیں بہت چاہتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں بیٹے کی

بھی خواہش ہے۔ وہ تجربہ کار اور بڑی بوڑھیوں سے بیٹا پیدا کرنے کے بارے میں مختلف طریقے اور ٹوٹکے پوچھتی رہتی ہے۔ وہ ملنگ بابا کے بارے میں کافی ریسرچ کر چکی ہے اور جب سے چودھرائن کے ہاں اولاد کی امید جاگی ہے، رضیہ کا اصرار بڑھ گیا ہے کہ ہم ملنگ بابا سے اس سلسلے میں بات کریں.....!''

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''یعنی تمہارا مطلب ہے، رضیہ اولاد نرینہ پیدا کرنے کے لیے ملنگ بابا کا تین روزہ ''دم کورس'' کرنا چاہتی ہے؟''

''جناب! اس کی خواہش تو یہی تھی!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''تو کیا تم اس سلسلے میں رضیہ کو ملنگ بابا کے پاس لے کر گئے تھے؟''

''نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ ملک صاحب..... کہ اس کام کے لیے میرا دل ہی نہیں مانا اور..... اب تو خیر یہ ممکن ہی نہیں رہا۔ ملنگ بابا اس جہاں سے کسی اور جہاں میں منتقل ہو چکے ہیں۔''

''منتقل ہو نہیں چکے عمر دین بلکہ انہیں منتقل کر دیا گیا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ملنگ بابا طبعی موت نہیں مرا بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے اور اغلب امکان اس بات کا ہے کہ یہ کسی شوہر کا ''کارنامہ'' ہے۔ تم میرا اشارہ سمجھ رہے ہو نا..... یہ بچے دینے والے ملنگ بابا شوہروں کی نظروں میں بڑے زور سے کھٹکتے ہیں۔''

''آپ کا اشارہ چودھری وحید اللہ کی طرف تو نہیں؟'' وہ تشویش بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''چودھری وحید اللہ کا معاملہ ابھی زیر غور ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ بھی میں ان شوہروں کو چیک کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جنہوں نے ملنگ بابا سے اپنی بیوی کا کوئی خفیہ علاج کرایا ہو۔''

''ملک صاحب! آپ پیروں فقیروں اور ملنگ ٹائپ لوگوں کے اتنا خلاف کیوں ہیں؟'' عمر دین نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''دیکھو عمر دین!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''سچے پیر فقیر اور ملنگ وغیرہ اللہ کے

دوست ہوتے ہیں، یعنی ولی اللہ۔ میں اولیائے کرام اور علمائے دین کے کبھی خلاف نہیں رہا، بلکہ دل سے ان کا بڑا احترام کرتا ہوں کیونکہ یہ دنیا انہی اللہ والوں کے دم قدم سے چل رہی ہے۔ میں صرف ان لوگوں کے خلاف ہوں جو بزرگی کے لبادے میں کسی اور ہی مشن پر ہوتے ہیں۔ معصوم اور سادہ لوح لوگ ایسے عیاروں کے حلیے اور وضع قطع سے دھوکا کھا کر انہیں کوئی پہنچا ہوا بابا سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے عقیدت مندوں کی اسی کمزوری سے کھیل کر اپنا الو اور بٹیر سیدھا کرتے رہتے ہیں۔ میرے تجربے میں ایسے درجنوں کیس ہیں۔ میں نے بہت سے ڈبا پیروں کو تو کیفرِ کردار تک بھی پہنچایا ہے۔''

''آپ کے خیال میں مقتول ملنگ بابا اصلی پیر تھا یا کوئی ڈھونگی؟'' عمر دین نے دوٹوک انداز میں سوال کیا۔

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''ابھی تک میں ملنگ بابا کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکا ہوں۔ آج صبح ہی تو میرا اس سے بلکہ.....اس کی لاش سے تعارف ہوا ہے اور آہستہ آہستہ واقعات و حالات کھل کر سامنے آنے لگے ہیں۔ میرا خیال ہے، ایک آدھ روز میں، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد میں کوئی یقینی بات کر سکوں گا۔''

ہمارے درمیان ملنگ بابا کی ذات کے حوالے سے بات چیت جاری تھی کہ بارش رک گئی۔ پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے سے بڑی کڑاکے دار بارش ہوئی تھی۔ عمر دین نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''کیا خیال ہے ملک صاحب! میں کھوجی چاچا مبارک کو لانے کے لیے روانہ ہو جاؤں؟''

''نہیں عمر دین! اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔'' میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اس بارش نے تو سارے کا سارا کھرا کھوہ کھاتے لگا دیا ہے!''

وہ تائیدی نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

✠ ✠ ✠

میں رات کو سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو ملنگ بابا کا ''آخری دیدار'' میری آنکھوں کے

سامنے ''تازہ'' ہوگیا۔ وہ اپنے حلیے اور وضع قطع سے مجھے جیسا نظر آیا تھا اس کی عمر اس ''حال'' سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ چہرے مہرے سے وہ مجھے زیادہ سے زیادہ پچیس سال کا لگا تھا۔ سائیں سادھو اور ملنگ بابا وغیرہ عموماً اتنی عمر کے دیکھنے میں نہیں آتے۔ اس کے خدوخال اور رنگ سے بھی یہی لگتا تھا کہ وہ کوئی روایتی سائیں بابا نہیں بلکہ مخصوص حالات نے اسے یہ رنگ اختیار کرنے پر مجبور کیا ہوگا۔ ایسے شخص کی اچانک موت بہت سے سنگین سوالات کو جنم دیتی ہے اور انہی متعدد سوالات میں ایک سنگین سوال چودھری وحید اللہ کی ذات کے حوالے سے بھی تھا.....!''

اس وقت میرا ذہن متضاد خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ عمر دین نے چودھرائن اور ملنگ بابا کی جس کرامت کا ذکر کیا تھا۔ اس سے میرے ذہن میں لاتعداد شکوک وشبہات سر اٹھا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ چودھری گزشتہ تیس سال سے بے اولاد تھا اور ملنگ بابا نے چودھرائن پر کرشماتی دم کر کے ایک لازوال خوشی کا سامان پیدا کر دیا تھا اور ملنگ بابا کے لیے رات کا کھانا نہایت پابندی کے ساتھ حویلی سے جاتا تھا۔ ان حالات وواقعات میں، ملنگ بابا کی موت کے حوالے سے سیدھا شک چودھری وحید کی طرف جاتا تھا لیکن دوسری جانب چودھری کا ''کردار'' اس شک کو پلک جھپکتے میں زائل کرتا دکھائی دیتا تھا۔ اگر کسی بھی سطح پر ملنگ کے قتل میں چودھری وحید کا ہاتھ شامل ہوتا تو وہ خاموشی سے اس کی لاش دبانے کو ترجیح دیتا۔ پولیس انکوائری کے چکر میں پڑنے کی حماقت نہ کرتا۔ حالات اس انداز میں الجھ کر رہ گئے تھے کہ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آنے تک حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں انہی خیالات میں غرق تھا کہ میرے کوارٹر کے دروزے پر دستک ہوئی۔ ''اس وقت کون آ گیا.....!'' میں نے زیرلب بڑبڑاتے ہوئے بستر چھوڑ دیا۔

اس وقت رات کے دس کا عمل ہوگا۔ میں نے اپنے تھانے کے عملے سے بڑے واضح الفاظ میں کہہ رکھا تھا کہ ایمرجنسی کی صورت میں، رات کے کسی بھی پہر مجھے جگایا جا سکتا ہے۔ وہ موسم گرما کی ایک حبس زدہ رات تھی اور میں نے اپنا بستر کوارٹر کے صحن میں لگا رکھا تھا۔ میری چھٹی حس چیخ چیخ کر یہ اعلان کر رہی تھی کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔

میں نے تیسری دستک مکمل ہونے پر دروازہ کھول دیا۔ میری نگاہ فرید خان کے چہرے سے ٹکرائی۔ فرید خان شبینہ ڈیوٹی والا ایک کانسٹیبل تھا۔ ان لمحات میں وہ خاصا سنجیدہ اور متفکر نظر آ رہا

تھا۔ میں نے استفسار کیا۔

''فرید خان! خیریت تو ہے..... تم اس وقت.....؟''

''ملک صاحب! دو بندے آپ سے ملنے آئے ہیں۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔

''کون ہیں وہ دونوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اور اس وقت انہیں مجھ سے کیا کام پڑ گیا؟''

''جناب! ان کا تعلق سرکاری اسپتال سے ہے۔'' فرید خان نے بتایا۔ ''وہ کوئی اہم خبر لے کر آئے ہیں اور فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''اہم خبر'' اور ''فوری ملاقات'' کے معاملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے آج صبح کانسٹیبل عمر دین کی نگرانی میں، ملنگ بابا کی لاش پوسٹ مارٹم کی غرض سے سرکاری اسپتال بھجوائی تھی۔ فطری انداز میں فوری طور پر میرا ذہن ملنگ بابا کے پوسٹ مارٹم کی طرف چلا گیا۔ میرے اندازے کے مطابق، لاش اور پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپوٹ کل دوپہر کے بعد ملنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اس وقت اسپتال سے کسی کے، مجھ سے آ کر ملنے کا ایک ہی مطلب تھا..... کوئی سنسنی خیز انکشاف!

''ٹھیک ہے، تم انہیں میرے کمرے میں بٹھاؤ۔'' میں نے کانسٹیبل فرید خان سے کہا۔ ''میں ابھی پانچ منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔''

وہ ''اچھا جناب!'' کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔

میں نے احتیاط کے پیشِ نظر تین منٹ کے اندر یونیفارم زیب تن کیا اور ٹھیک پانچ منٹ بعد میں اپنے کمرے میں موجود تھا اور..... وہ دونوں میرے رُوبرو!

رسمی علیک سلیک کے دوران ہی میں، میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا۔ وہ اندر باہر سے مجھے گھبرائے ہوئے دکھائی دیے۔ ''کیا بات ہے۔ اس وقت آپ لوگوں کی آمد کا مقصد کیا ہے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہمیں اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔'' ان میں سے ایک نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''آپ کو اسی وقت ہمارے ساتھ اسپتال جانا ہوگا۔''

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''آخر معاملہ کیا ہے۔ اس ایمرجنسی کی

ضرورت کیوں پیش آ گئی؟''

''اصل معاملہ تو کسی کو پتا نہیں تھانیدار صاحب۔'' ان میں سے دوسرے نے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے ایڈمنسٹریٹر صاحب اور میڈیکل آفیسر میں خفیہ میٹنگ ہوئی ہے جس کے نتیجے میں ایڈمنسٹریٹر صاحب نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

میرے اندر سر اٹھانے والے تجسس نے پوچھا۔ ''کیا یہ معاملہ اس ملنگ بابا سے متعلق ہے جس کی لاش کو آج صبح میں نے پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوایا تھا؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جناب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس سلسلے میں تفصیلات کیا ہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔''

وہ دونوں اتنی بڑی اور پُراسرار خبر لے کر آئے تھے کہ میرے تن بدن میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ میں نے کانسٹیبل فرید خان کو اپنے ساتھ لیا اور اسی وقت اسپتال سے آنے والوں کے ہمراہ تانگے پر سوار ہو کر تھانے سے روانہ ہو گیا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد میں اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر اور میڈیکولیگل آفیسر کے ساتھ ایک کمرے میں موجود تھا۔ اس کمرے میں ہم تینوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد ایڈمنسٹریٹر نے مجھ سے کہا۔

''سوری ملک صاحب! آپ نے صبح جس ملنگ کی لاش بھیجی تھی اس کا پوسٹ مارٹم نہیں ہو سکتا!''

''پوسٹ مارٹم نہیں ہو سکتا!'' میں اچھل پڑا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا.....؟''

میڈیکولیگل آفیسر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''تھانیدار صاحب! آپ اچھی طرح جانتے ہیں، پوسٹ مارٹم صرف ڈیڈ باڈی کا کیا جاتا ہے۔''

''تو.....؟'' میری حیرت دوچند ہو گئی۔

''جناب! اس ملنگ بابا کی موت واقع نہیں ہوئی؟'' ایڈمنسٹریٹر نے کہا۔ ''اس کے ماہرانہ معائنے سے پتا چلا ہے کہ وہ زہریلی خوراک کے زیر اثر گہری بے ہوشی میں چلا گیا تھا۔ اس کے جسم کو دیکھ کر بہ ظاہر ایسا ہی لگتا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ زندہ ہے۔''

میں ہکا بکا باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھنے لگا۔ میڈیکولیگل آفیسر تفصیلات سے

آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے پاس جو ڈیڈ باڈیز لائی جاتی ہیں، ان کا پوسٹ مارٹم شروع کرنے سے پہلے ہم چند ایک حساس نوعیت کے ٹیسٹ کرتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ وہ شخص ایک سو ایک فیصد زندوں میں شمار کیے جانے کے قابل نہیں۔ ایسے ہی ایک ٹیسٹ سے پتا چلا کہ ملنگ بابا میں زندگی کی رمق باقی ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز انکشاف تھا۔ اس انکشاف..... کے بعد میں نے پوسٹ مارٹم کے عمل کو شروع ہونے سے پہلے ہی رکوا دیا اور متعلقہ عملے کو فوری ہدایت کی، وہ ملنگ بابا کو گہری بے ہوشی سے عالم ہوش میں لانے کی سر توڑ کوششیں شروع کر دیں.....''

''ان کوششوں کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہوا؟'' میڈیکو لیگل آفیسر کے خاموش ہوتے ہی میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی ہاں۔ ہم نے ملنگ بابا کے معدے کو زہریلی خوراک سے پاک کر دیا ہے۔ اس زہر نے خون میں شامل ہو کر جو ''کارنامے'' دکھائے ہیں ان کے تاثرات کو زائل کرنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ ملنگ بابا خطرے کے زون سے تو باہر نکل آیا ہے مگر ابھی حواس میں نہیں آ سکا۔ وہ گہری نیند میں ہے۔ امید ہے کل صبح یا پھر دوپہر تک وہ مکمل ہوش و حواس میں آ جائے گا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس کی بے ہوشی اور گہری نیند میں ان ادویہ کا بھی ہاتھ ہے جو زہر کے تریاق کے طور پر، ملنگ بابا کے جسم میں انجیکٹ کی گئی ہیں۔''

''کیا میں ابھی ملنگ بابا کو دیکھ سکتا ہوں؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''کیوں نہیں ملک صاحب۔'' ایڈمنسٹریٹر تعاون آمیز لہجے میں جلدی سے بولا۔ ''ملنگ بابا آپ کا کیس ہے۔ آپ کو ملاقات سے روکا تو نہیں جا سکتا نا۔ ویسے.....'' وہ لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''کیا آپ کو ملنگ بابا کے زندہ بچ جانے کی خوشی نہیں ہوئی؟''

''یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے والی بات ہے جناب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ملنگ بابا کے زندہ بچ جانے سے تو یہ کیس حل کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔''

''اب تک اس سلسلے میں کوئی پیش رفت ہوئی ہے؟''

''کوئی خاص نہیں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''آخر آپ پولیس والے ہیں نا.....!'' ایڈمنسٹریٹر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شکایتی لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

''مطلب یہ کہ.....'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم سے ایک ایک بات کرید کرید کر پوچھ لیں گے اور جب ہم آپ کی تفتیش سے متعلق کوئی سوال کریں تو بڑا ڈپلومیٹک جواب ملتا ہے..... ہے کہ نہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں جناب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ حقیقت ہے کہ ملنگ بابا کی زہر خورانی کے سلسلے میں ابھی تک میں کوئی سراغ یا سرا تلاش نہیں کر سکا۔''

''آپ بادشاہ ہیں ملک صاحب..... جیسی آپ کی مرضی۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''آئیں، میں آپ کو ملنگ بابا کے پاس لے چلتا ہوں۔''

میں نے بحث کا کوئی نیا در کھولنے کے بجائے خاموشی اختیار کی اور ان دونوں اصحاب کے ہمراہ اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں ملنگ بابا کو ''انڈر ایمرجنسی'' ٹریٹمنٹ رکھا گیا تھا۔ وہ اسپتال کے بستر پر چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند اور بدن ساکت تھا۔ ایک بازو کی نس میں گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ کچھ دوسرے میڈیکل آلات و نلکیاں بھی اس کے جسم پر نظر آئی تھیں۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر زندگی کے آثار تو نظر آتے تھے تاہم وہ بات چیت اور استفسار کی منازل سے سیکڑوں میل دور تھا۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولی تو وہ بڑی دھیمی، رفتار سے چل رہی تھی۔ خوشی اور اطمینان کی بات یہ تھی کہ ملنگ بابا زندہ تھا جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مکمل طور پر ہوش میں آنے کے بعد، اس کی زبان سے سنسنی خیز انکشافات کی توقع کی جا سکتی تھی۔

میں لگ بھگ پندرہ منٹ تک بے ہوش پڑے ملنگ بابا کو تنقیدی نظر سے دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر کا دعویٰ تھا کہ کل صبح یا زیادہ سے زیادہ دوپہر تک وہ ہوش میں آ جائے گا۔ لہٰذا اس کے ہوش میں آنے تک انتظار کرنے کی سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ اس صورتِ حال کی روشنی میں ملنگ کا بیان کل سہ پہر تک متوقع تھا۔ میں اس کا بیان لے لیتا تو پھر تفتیش کا کوئی رخ متعین کیا جا سکتا تھا۔ اندھیرے میں خوامخواہ ٹامک ٹوئیاں مارنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں ایڈمنسٹریٹر اور میڈیکولیگل آفیسر کے ہمراہ ایک مرتبہ پھر ایڈمنسٹریٹر کے کمرے میں آ

بیٹھا۔ ایڈمنسٹریٹر نے مجھ سے پوچھا۔

''ملک صاحب! آپ کیا کہتے ہیں؟''

میں نے باری باری ان دونوں کے چہرے کا بغور جائزہ لیا پھر گمبھیر انداز میں کہا۔ ''یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ملنگ بابا زہر خورانی کے باوجود زندہ سلامت ہے۔ میری آپ سے ایک چھوٹی سی درخواست ہے.....!''

''درخواست نہیں جناب، آپ حکم کریں۔'' ایڈمنسٹریٹر بڑی رسان سے بولا۔ ''ہم تو ہر وقت قانون سے تعاون کے لیے تیار رہتے ہیں۔''

''جیسا کہ اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں، ملنگ بابا کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت موت کے گھاٹ اتارنے کی سنگین کوشش کی گئی تھی۔ یہ تو ملنگ کی خوش قسمتی اور آپ لوگوں کی کارکردگی ہے کہ وہ زندہ بچ گیا۔ جس کسی نے بھی ملنگ کو زہر دیا ہے وہ اس کا خطرناک دشمن ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کل دوپہر تک.....یعنی جب تک ملنگ حلفیہ بیان دینے کے قابل نہیں ہو جاتا، اس کے زندہ بچ جانے کے بارے میں اس کے دشمن کو کوئی خبر نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اس خیال سے مطمئن رہے گا کہ ملنگ کا قصہ پاک ہو چکا ہے۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' ایڈمنسٹریٹر نے سوال کیا۔

''اس سے یہ ہوگا کہ قاتل اپنے کارنامے پر خوش اور پُرسکون رہے گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''لیکن اگر وہ یہ جان لیتا ہے کہ ملنگ بابا پر اس کا وار خالی گیا ہے تو راز کھل جانے کے ڈر سے وہ دوبارہ ملنگ بابا کی جان لینے کی کوشش کر سکتا ہے اور اس مرتبہ وہ اپنی اس خطرناک کوشش میں کامیابی بھی حاصل کر سکتا ہے۔''

''اسپتال کے اندر ملنگ بابا کڑی نگرانی میں ہے ملک صاحب!'' ایڈمنسٹریٹر نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''میرے خیال میں اس کا دشمن یہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ میں اسپتال کے عملے کو چوکس کر دیتا ہوں۔ آپ اسپتال کی طرف سے تو بالکل بے فکر ہو جائیں۔''

''مجھے آپ کے اسپتال اور یہاں کے حفاظتی انتظامات پر پورا بھروسا ہے جناب!'' میں نے ایڈمنسٹریٹر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''لیکن احتیاطی تدابیر اختیار کرنے میں آخر حرج ہی کیا ہے۔ فرض کریں، اگر ملنگ بابا کا ''قاتل'' کوئی بارسوخ اور طاقتور انسان ہے تو وہ کبھی

نہیں چاہے گا کہ ملنگ کسی نوعیت کا کوئی بیان دینے کی پوزیشن میں آئے۔ وہ ملنگ کو ٹھکانے لگانے کے لیے کوئی اور خطرناک حربہ بھی آزما سکتا ہے۔''

''ملک صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میڈیکولیگل آفیسر نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''احتیاط اور رازداری اس معاملے میں نہایت ہی مفید ثابت ہوگی۔''

ایڈمنسٹریٹر نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''کیا اس بات کے امکانات ہیں کہ ملنگ کو قتل کرنے میں کسی طاقتور شخصیت کا ہاتھ ہو؟''

''جب تک کوئی کیس حل نہیں ہو جاتا، ہر بات کے امکانات بہرحال موجود رہتے ہیں۔'' میں نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب میں ''ہاں'' میں دوں گا۔''

''آپ کو کس بااختیار شخص پر شک ہے؟'' ایڈمنسٹریٹر کے لہجے میں تشویش شامل ہوگئی۔

''میں ابھی تک اس سلسلے میں اپنے ذہن کو کلیئر نہیں کر پایا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جیسے ہی میں کسی نتیجے پر پہنچوں گا، یہ میرا وعدہ ہے کہ آپ کو ضرور بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ایڈمنسٹریٹر نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''آپ کے خیال میں ملنگ کے حوالے سے ہمیں کس نوعیت کی احتیاطی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں؟''

جب میں ان لوگوں کو کسی طاقتور شخصیت کے اس معاملے میں ملوث ہونے کے بارے میں بتا رہا تھا تو اس وقت میرے ذہن میں صرف اور صرف چودھری وحید اللہ کا نام تھا۔ اگرچہ چودھری نے اپنے کردار اور رویے سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ملنگ بابا کا سچا خیر خواہ ہے۔ ملنگ کے قتل کی کوشش میں اس کا ہاتھ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا تاہم تفتیش کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ کبھی کسی صورتِ حال سے مطمئن نہ ہوں۔ شک کی عادت جلد یا بہ دیر بہت سارے سربستہ رازوں کو کھول کر رکھ دیتی ہے لہٰذا میں چودھری کی ذات کو کسی بھی قیمت پر نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ایڈمنسٹریٹر کے سوال کے جواب میں، میں نے کہا۔

''اول تو یہ خبر اسپتال کی چار دیواری کے اندر قید رہنا چاہیے کہ ملنگ بابا موت کے جبڑوں سے نکل کر زندگی کی گود میں آ چکا ہے۔ دوم، اس کی بحالی صحت کی کوشش کی طرف سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونا چاہیے۔ سوم، اگر کسی بھی طرح ملنگ کے زندہ بچ جانے کی خبر اسپتال سے باہر

چلی جاتی ہے اور کوئی شخص اس کو دیکھنے اور اس کی خیر و عافیت معلوم کرنے کے لیے اسپتال کا رخ کرتا ہے تو کسی بھی قیمت پر ایسے شخص کو ملنگ بابا تک نہیں پہنچنے دینا.....'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں کل کسی وقت چکر لگاؤں گا۔ امید ہے، اس وقت تک ملنگ بابا کو ہوش آ چکا ہوگا۔ پھر میں اس کا تفصیلی بیان قلم بند کرلوں گا۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب!'' ایڈمنسٹریٹر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم آپ کی ہدایت پر پوری طرح عمل کریں گے۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔''

میں بے فکر ہو کر اٹھا اور باری باری ان سے مصافحہ کرنے کے بعد اسپتال سے نکل آیا۔ جب میں اور کانسٹیبل فرید خان اسپتال کے گیٹ سے باہر نکل رہے تھے تو اسی وقت گیٹ کے سامنے ایک سجا سجایا تانگا آ کر رکا۔ تانگے کی اگلی نشست پر میں چودھری وحید اللہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چودھری اور وہ بھی رات کے گیارہ بجے اسپتال میں.....؟

فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ کہیں چودھری کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہوگئی۔ میری معلومات کے مطابق وہ دل کا مریض تھا لیکن اگلے ہی لمحے مجھے اپنے خیال کی تردید کرنا پڑی۔ وہ بیمار نہیں بلکہ اچھا خاصا لگ رہا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ بڑے چاق و چوبند انداز میں تانگے سے اترا اور میری جانب قدم بڑھانے لگا۔ کوچوان کے علاوہ ایک اور باڈی گارڈ ٹائپ ڈشکرا بھی چودھری کے ساتھ آیا تھا۔ وہ چودھری کی تقلید میں اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

روبرو پہنچ کر ہم دونوں نے حیرت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر سوال میں پہل میں نے کی۔ ''چودھری صاحب! خیریت تو ہے..... آپ آدھی رات کو اسپتال میں.....؟''

سچی بات تو یہ کہ موجودہ صورت حال میں میرے ذہن میں فوری طور پر یہی شک ابھرا تھا کہ کسی طرح چودھری کو ملنگ بابا کے زندہ بچ جانے کی اطلاع مل گئی ہے اور وہ اس کی ''خبر'' لینے دوڑا دوڑا اسپتال پہنچا ہے لیکن اس کے جواب نے ایک نئی سچویشن پیدا کر دی۔

''میں آپ سے ملنے تھانے گیا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وہاں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ اسپتال سے دو بندے آپ کو کسی ایمرجنسی میں بلانے آئے تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ ادھر کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے..... اسپتال میں سب خیریت تو ہے نا؟''

اس کے استفسار میں بڑی کرید تھی۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''آپ کے خیال میں، یہاں اسپتال میں کس قسم کی گڑبڑ ہو سکتی ہے؟''

سوال کرنے کے دوران میں، میں مسلسل چودھری کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ لکنت زدہ انداز میں بولا۔ ''مم..... میرا مطلب ہے، آپ اگر..... اتنی رات کو یہاں آئے ہیں تو..... کوئی خاص بات ہی..... ہوگی نا.....!''

''خاص بات اور گڑبڑ میں بہت فرق ہوتا ہے چودھری صاحب!'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر صاحب نے ملنگ بابا کے پوسٹ مارٹم کے حوالے سے ایک اہم مشورہ کرنے کے لیے یہاں بلایا تھا۔''

''کیا ہوا..... پوسٹ مارٹم کے سلسلے میں کیسا مشورہ کرنا تھا.....؟'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

اس کا انداز لحہ بہ لحہ میرے شک میں اضافہ کر رہا تھا۔ میں نے اسے چکر دینے کے لیے ایک فرضی اور غیر متعلق بات کہہ دی۔ یہ آئیڈیا فوری طور پر میرے ذہن میں آیا تھا۔

''چودھری صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میڈیکولیگل آفیسر کو پتا چل گیا ہے کہ ملنگ بابا کے معدے میں جو زہر پہنچا ہے وہ کسی میٹھے کھانے (سویٹ ڈش) کے ذریعے دیا گیا ہے۔'' میں نے لمحے بھر کے لیے رک کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور وہاں مجھے ایک طوفان سا امڈتا دکھائی دیا جو اس کے اندرونی جذبات اور ہیجان کی عکاسی کرتا تھا۔ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''اب آپ فرمائیں کہ آدھی رات کو مجھ سے ملنے کے لیے تھانے کیوں گئے تھے جبکہ آپ دل کے مریض بھی ہیں.....؟''

میں توقع کر رہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی لنگڑی تاویل پیش کرنے کی کوشش کرے گا لیکن اس وقت میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے میرے سوال کو سنا اَن سنا کرتے ہوئے اضطراری انداز میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے، رمضو کا شک بالکل درست ہے.....''

''رمضو کا شک؟'' میں الجھن زدہ نظر سے چودھری کو دیکھنے لگا۔

''نہیں..... میں جس مقصد سے یہاں آیا تھا وہ پورا ہو چکا۔''

میں نے ذومعنی انداز میں کہا پھر پوچھا۔''آپ کو کوئی کام ہے یہاں؟''

''بالکل نہیں!'' اس نے پوری قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی۔''مجھے تو صرف آپ سے کام ہے جناب..... آپ ہی کو ڈھونڈتا ہوا میں تھانے سے یہاں پہنچا ہوں۔'' وہ لمحے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر تانگے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

''آپ آئیں میرے ساتھ۔ ہمیں فوراً صورت نگر پہنچنا ہے۔ میرا خیال ہے، میں نے ملنگ بابا کے قاتل کا سراغ لگا لیا ہے.....''

چودھری وحید اللہ کو ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ ملنگ بابا موت کے جبڑوں میں سے زندہ سلامت نکل آیا ہے۔ اسی لیے وہ اس کے ''قاتل'' کا تذکرہ کر رہا تھا تاہم پچھلے پانچ منٹ میں اس نے جو بے ربط گفتگو کی وہ پے در پے سنگین انکشافات کی حیثیت رکھتی تھی۔ میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے تانگے پر سوار ہو گیا۔ ہم دونوں تانگے کی اگلی نشست پر بیٹھے جبکہ کانسٹیبل فرید خان چودھری کے باڈی گارڈ کے ساتھ عقبی نشست پر موجود تھا۔ کوچوان نے جیسے ہی تانگے کو حرکت دی، میں چودھری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''چودھری صاحب! ابھی ابھی آپ نے جو سنسنی خیز باتیں کی ہیں وہ میری عقل میں ٹھیک طرح سے بیٹھ نہیں سکی ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھنا شروع کیا۔''رمضو کا کون سا شک درست نکلا ہے اور..... آپ نے ملنگ بابا کے قاتل کی حیثیت سے کس شخص کا سراغ لگایا ہے.....؟''

ویسے ایک بات تھی کہ چودھری نے مجھ سے ملنے کے بعد، اسپتال کا رخ نہ کر کے یہ بات تو ثابت کر دی تھی کہ وہ ملنگ بابا کے زندہ بچ جانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر وہ ملنگ بابا کی وجہ سے اسپتال آیا ہوتا تو اسے دیکھے بغیر وہ واپس جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا جس سے یہ امر بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا تھا کہ ملنگ بابا کو زہر خورانی میں وہ کسی بھی حوالے سے اور کسی بھی سطح پر ملوث نہیں تھا۔ اب..... اس واقعے کے بعد اس کی طرف سے میرا دل اور ذہن بالکل صاف ہو گیا تھا۔

''ملک صاحب!'' وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔''رمضو نے

مجھے بتایا ہے کہ نصیباں بی بی پچھلے تین چار دن سے ملنگ بابا کے لیے میٹھا بنا کر لے جاتی رہی ہے اور وہ بھی رات کے کھانے کے بعد۔ میں نے.....''

''نصیباں بی بی.....!'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ نصیباں کون ہے؟''

''یہ ادھر ہی صورت نگر ہی میں اپنے بھائی کے ساتھ رہتی ہے۔'' چودھری نے بتایا۔ ''اس کا بھائی غفور احمد صورت نگر میں کپڑے اور جوتے کی دکان کرتا ہے۔ نصیباں پہلے ضلع جھنگ کے ایک گاؤں جمال پور میں رہتی تھی۔ وہ دو تین سال سے ادھر صورت نگر میں آئی ہوئی ہے۔ اس کا دنیا میں اور کوئی رشتے دار وغیرہ نہیں ہے۔ میں.....''

''ایک منٹ چودھری صاحب!'' میں نے ایک مرتبہ پھر قطع کلامی کی۔ ''نصیباں کے بارے میں ہم بعد میں بات کرتے ہیں۔ پہلے آپ یہ بتائیں کہ رمضو نے آپ کو کب بتایا کہ نصیباں پچھلے تین چار دن سے ملنگ بابا کو میٹھا کھانا پہنچاتی رہی ہے اور وہ بھی رات کے کھانے کے بعد؟''

میری معلومات کے مطابق، چودھری وحید اللہ کا وفادار ملازم رمضان عرف رمضو آج علی الصباح امین آباد چلا گیا تھا اور اس کی واپسی کل دوپہر تک ہونے والی تھی۔ چودھری نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ ملنگ بابا کو پیش آنے والے ''حادثے'' کی خبر رمضو کے جانے کے بعد منظرِ عام پر آئی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ رمضو نے نصیباں کے حوالے سے جو بات کی تھی وہ چودھری کو پہلے سے پتا تھی۔ وہ آج صبح مجھے بتانا بھول گیا تھا یا پھر دانستہ اس نے یہ معاملہ مجھ سے چھپایا تھا۔ ویسے تازہ ترین صورتِ حال کے پیشِ نظر زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ مجھے بتانا بھول گیا ہوگا۔

چودھری نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''ملک صاحب! یہ بات رمضو نے تھوڑی دیر پہلے ہی مجھے بتائی ہے۔''

''تھوڑی دیر پہلے.....'' میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''لیکن چودھری صاحب! رمضو تو آج صبح سویرے امین آباد آپ کی چھوٹی ہمشیرہ زبیدہ بیگم کے پاس نہیں چلا گیا تھا.....؟ آپ نے بتایا تھا کہ وہ کل دوپہر میں واپس آئے گا۔''

''جی ہاں، میں نے آپ کو یہی بتایا تھا۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور میری الجھن دور کرتے ہوئے بولا۔ ''آنا تو اس کو کل ہی تھا لیکن وہاں پہنچ کر اسے ایک ایسا ضروری کام یاد

آ گیا جس کا تعلق صورت نگر سے ہے لہٰذا اسے رات ہی میں واپس آنا پڑا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے لمحے بھر کو رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''جب وہ یہاں پہنچا تو میں نے اسے فوراً حویلی میں بلا لیا۔ ملنگ بابا کی افسوسناک موت کا ذکر ہوا تو اسی وقت رمضو نے نصیباں بی بی اور اس کے ''میٹھے کھانے'' کے بارے میں بتایا۔ رمضو نے خود اسے اپنی آنکھوں سے ملنگ بابا تک کھانا پہنچاتے ہوئے دیکھا تھا اور اب..... آپ بھی بتا رہے ہیں کہ ڈاکٹر کے مطابق ملنگ بابا کے معدے میں اترنے والا زہر میٹھے کھانے کے ذریعے پہنچا تھا۔ میں تو کہتا ہوں جناب..... آپ اس نصیباں بی بی کو گرفتار کر کے کڑی تفتیش سے گزاریں، پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ ذرا پتا تو چلے..... وہ میٹھے میٹھے کھانے لے کر ملنگ بابا کے پاس کیوں جاتی تھی۔'' وہ ایک بار پھر رک کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اب اس کا سینہ کنٹرول میں آیا تو اس نے گمبھیر انداز میں بات مکمل کر دی۔

''ملک صاحب! مجھے رمضو کی زبانی جیسے ہی اس حقیقت کا پتا چلا، میں تانگا پکڑ کر سیدھا آپ کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے ملنگ بابا کے معاملے میں اپنی صحت اور بیماری کا بھی خیال نہیں کیا۔ آپ تھانے میں نہیں ملے تو میں اسپتال تک دوڑا چلا آیا۔ حالانکہ اگر میں چاہتا تو یہ بات آپ کو صبح بھی بتائی جا سکتی تھی لیکن نہیں جناب.....'' اس نے نفی میں گردن ہلائی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں یہ چاہتا ہوں کہ ملنگ بابا کا قاتل جلد از جلد قانون کی گرفت میں آ جائے اور آپ اس کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیں۔''

''انشاء اللہ! چودھری صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کی یہ خواہش بہت جلد پوری ہو گی اور اس کے ساتھ ہی.....'' میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے تھوڑا وقفہ دیا اور پھر کہا۔ ''اس کے ساتھ ہی آپ کے لیے میرے پاس ایک بہت بڑی خوشخبری بھی ہے۔''

''خوشخبری.....!'' وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیسی خوشخبری ملک صاحب؟''

میں نے چودھری وحید اللہ کو ملنگ بابا کے زندہ بچ جانے کے بارے میں بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا تاہم اس کا دماغ پڑھنے کے لیے میں نے جواب کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔

''آپ اندازہ لگانے کی کوشش کریں چودھری صاحب، میرا اشارہ کس خوشخبری کی جانب ہے.....؟''

''ملک صاحب! اس وقت جو حالات ہیں.....'' وہ متاملانہ انداز میں بولا۔''ان میں تو میرے لیے سب سے بڑی خوشخبری یہ ہوگی کہ آپ جلد از جلد ملنگ بابا کے قاتل کو گرفتار کر کے، قانون کے مطابق، عدالت سے اسے قرار واقعی سزا دلوائیں۔''

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے چودھری صاحب!'' مین نے سسپنس کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔''اس سے بھی بڑی خوشخبری.....!''

''اس سے بڑی خوشخبری کیا ہوسکتی ہے جناب.....؟'' وہ حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولا۔''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا.....!''

''بتادوں.....؟'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''ہاں..... بتادیں۔''

''ملنگ بابا زندہ ہے.....!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کک..... کیا.....؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''ذرا سنبھل کر چودھری صاحب!'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔''آپ دل کے مریض ہیں.....!''

میں نے اس خوشخبری کو چودھری تک پہنچانے کے لیے دانستہ گفتگو کو مرحلہ وار طویل کیا تھا تاکہ چودھری کو اچانک کوئی شاک نہ لگے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آدھی رات کو تانگے میں سفر کرتے ہوئے شادی مرگ ایسی کیفیت پیدا ہو جائے اور میں اپنی اس کوشش میں ایک سو ایک فیصد کامیاب رہا تھا۔ چودھری وحید، ملنگ بابا کے زندہ ہونے کا سن کر اچھلا ضرور تھا تاہم اس کے دل کو کوئی خطرناک دھچکا نہیں لگا تھا۔

سرسراتی ہوئی آواز میں اس نے مجھ سے پوچھا۔''ملک صاحب! کہیں آپ مذاق تو نہیں کر رہے.....؟''

''بالکل نہیں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔''یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ میں ابھی اسپتال میں زندہ ملنگ بابا کو دیکھ کر آ رہا ہوں۔''

پھر میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں چودھری کو اپنی اور اسپتال والوں کی کارکردگی کے بارے میں بتایا۔ یہ تفصیل سننے کے بعد وہ مچل اٹھا۔

''ملک صاحب! میں ابھی اور اسی وقت اسپتال جا کر ملنگ بابا کو دیکھنا چاہتا ہوں.....''

''اس کام کے لیے آپ کو کل تک انتظار کرنا پڑے گا۔'' میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔

''وہ کیوں.....؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''وہ اس لیے کہ.....'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''ملنگ بابا کے معدے کو زہریلے اثرات سے پاک کر کے اس کی جان تو بچالی گئی ہے لیکن ابھی وہ گہری بے ہوشی میں ہے۔ ڈاکٹر بڑی توجہ اور احتیاط سے اس کا علاج کر رہے ہیں۔ کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں۔ مجھے بھی اسی لیے بلایا گیا تھا کہ یہ ایک پولیس کیس ہے۔ آپ کل صبح یا زیادہ سے زیادہ دوپہر تک انتظار کرلیں تو یہ آپ کے ساتھ ساتھ ملنگ بابا کے حق میں بھی بہتر ہوگا۔''

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور وہ اسپتال جا کر ملنگ بابا کو دیکھنے کی ضد سے باز آ گیا پھر تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے تشکرانہ انداز میں بولا۔

''اے مالک..... تیرا لاکھ احسان اور کروڑ کروڑ شکر ہے کہ تُو نے میرے ملنگ بابا کو زندہ سلامت رکھا۔''

ادھر چودھری کی بات ختم ہوئی، ادھر آسمان نے رونا شروع کر دیا۔ یہ بھادوں کا مخصوص انداز ہے کہ وہ دھوپ بھرے دن اور تاروں سے سجی رات کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

✠ ✠ ✠

رات کا ایک بجا تھا۔ گھنٹا بھر برسنے کے بعد بارش تھم چکی تھی۔ میں چند منٹ پہلے ہی تھانے پہنچا تھا..... اور میں اکیلا واپس نہیں آیا تھا۔ میرے ساتھ کانسٹیبل فرید خان کے علاوہ نصیباں بی بی، اس کا بھائی غفور احمد اور چودھری کا وفادار ملازم رمضان عرف رمضو بھی تھا۔ چودھری وحید اللہ کو ہم نے اس کی حویلی واقع صورت نگر پہنچانے کے بعد تھانے کا رخ کیا تھا۔

دراصل صورت نگر میرے تھانے کی جنوبی سمت میں اور سرکاری اسپتال بالکل شمالی

جانب واقع تھا۔ اسپتال سے ہم سیدھے صورت نگر گئے تھے۔ چودھری کو حویلی پہنچانے کے بعد میں نے رمضو کی رہنمائی میں غفور احمد کے گھر پر چھاپا مار کر غفور، اس کی بہن نصیباں کو اٹھالیا تھا۔ رمضو کو میں نے اس لیے ساتھ رکھا تھا کہ اس کی موجودگی میں نصیباں سے پوچھ گچھ کر سکوں۔ رمضو اس امر کا چشم دید گواہ تھا کہ نصیباں رات میں چپکے چپکے ملنگ بابا کو ''سویٹ ڈش'' پہنچایا کرتی تھی۔

غفور احمد کی عمر لگ بھگ پچپن سال رہی ہوگی۔ وہ شکل اور بات چیت سے ایک سیدھا سادا اور معقول انسان نظر آتا تھا۔ وہ رات گئے خود کو اور اپنی بہن کو یوں تھانے لائے جانے پر خاصا برہم دکھائی دیتا تھا۔ میں دراصل صرف نصیباں کو اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا لیکن غفور بھی چلا آیا تھا۔ میں نے نصیباں سے پوچھ گچھ شروع کرنے سے پہلے غفور سے کہا۔

''چاچا! تم ذرا باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو، میں تھوڑی دیر بعد تمہیں اندر بلاتا ہوں۔''

''تھانیدار صاحب! پتا نہیں آپ کو میری بہن پر کس قسم کا شک ہوگیا ہے۔'' وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''آپ یقین کریں اس بے چاری نے کوئی جرم نہیں کیا۔ یہ تو خود بڑی دکھوں کی ماری ہے۔ میرے پاس پڑی اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر رہی ہے۔ اگر یہ ملنگ بابا کو کھانا وغیرہ کھلاتی رہی ہے تو اس میں خرابی کی کیا بات ہے۔ گاؤں کے اکثر لوگ ملنگ جی کے لیے کچھ نہ کچھ بھیجتے ہی رہتے ہیں۔''

جب میں نصیباں اور غفور کو اپنے ساتھ لے کر آ رہا تھا تو وہاں کے گھر میں، سویٹ ڈش کے حوالے سے بات ہوئی تھی۔ غفور بھی اسی کھانے کا حوالہ دے رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت ہی نرمی سے کہا۔

''دیکھو چاچا! ملنگ بابا زہریلا کھانا کھانے سے ہلاک ہوا ہے لہٰذا مجھے تو اپنی تفتیش مکمل کرنا ہے۔ کل صبح سے شام بلکہ رات تک جن جن لوگوں نے بھی ملنگ بابا کو کھانے پینے کی کوئی شے دی ہے، میں ان سے ضرور پوچھ گچھ کروں گا۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تمہاری بہن نے کچھ نہیں کیا تو تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم بے فکر ہو کر برآمدے میں بیٹھو۔''

وہ بادل نخواستہ میرے کمرے سے نکل گیا۔

میں نصیباں کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ ''شرافت سے سچ بولنے کا ارادہ ہے یا مجھے سختی پر مجبور کرو گی؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تھانیدار جی..... میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔''

''جب تم نے کچھ نہیں کیا تو پھر معافی کس چیز کے لیے مانگ رہی ہو۔'' میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا۔ ''اور یہ تمہارا رنگ کیوں اُڑا اُڑا سا ہے..... ہیں؟''

نصیباں بی بی کی عمر پچاس کے آس پاس رہی ہو گی۔ وہ عام سی شکل کی مالک ایک گھریلو عورت تھی۔ جب سے میں اس سے ملا تھا، میں نے اس کے رویے اور انداز میں ایک عجیب سا کھچاؤ، ایک نامعلوم سی ہچکچاہٹ اور ایک شک میں مبتلا کر دینے والا گریز نوٹ کیا تھا۔ یہ تمام تر کیفیت مجھے اس کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دیتی تھی۔ میرے استفسار کے جواب میں اس نے کہا۔

''جناب! آپ یقین کریں، ملنگ بابا کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔''

''کیا تم کل رات میں ملنگ بابا کے لیے کھانے کی کوئی میٹھی شے لے کر پیپل کے درخت تک گئی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہچکچاہٹ آمیز نظر سے کبھی مجھے اور کبھی رمضو کو دیکھنے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''یہ رمضو اس بات کا گواہ ہے کہ تم وہاں گئی تھیں۔ اس نے تمہیں اپنی آنکھوں سے ملنگ بابا کو کھانے کا برتن دیتے ہوئے دیکھا تھا اس لیے..... جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''جی.....'' وہ اثبات میں گردن ہلاتی ہوئے دھیمے انداز میں بولی۔ ''میں وہاں گئی تھی۔''

''کیا لے کر.....؟'' میں نے اسے گھورنا جاری رکھا۔ ''بتاؤ، تم وہاں کیا لے کر گئی تھیں.....؟''

''کھیر تھی میرے پاس.....!'' وہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' ایسی کیفیت میں نظر آتی تھی۔ ''ملنگ بابا کو کھیر بہت پسند تھی.....!''

''برتن میں کھیر تھی اور کھیر میں زہر.....'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''ہیں نا؟''

''نہیں.....'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''مم.....میں نے ملنگ بابا کو زہر نہیں دیا.....اس کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ آپ چاہیں تو مجھ سے.....بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔''

''اس کی موت میں.....'' میں نے اسی کے کہے ہوئے الفاظ کو طنزیہ انداز میں دہرایا۔ ''یعنی ملنگ بابا کے لیے تمہارے دل اور زبان میں اتنا احترام بھی نہیں کہ ''ان کی موت میں'' کہہ سکو.....اور ہاں۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''نصیباں بی بی! یہ بات اچھی طرح ذہن میں بٹھا لو کہ قانون کے سامنے چھوٹی بڑی قسمیں کھانے سے کام نہیں چلتا۔ یہاں ہر معاملے کو اپنے عمل سے اور ٹھوس ثبوت کے ساتھ ثابت کرنا پڑتا ہے۔ کچھ سمجھ میں آیا کہ نہیں؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خوفزدہ نظر سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ملنگ کے پوسٹ مارٹم سے پتا چلا ہے کہ اسے کسی میٹھے کھانے میں زہر ملا کر کھلایا گیا ہے۔ سچ سچ بتا دو، حقیقت کیا ہے۔ تم عورت ذات ہو، مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ تم پولیس کی کڑی تفتیش کے سامنے ٹک نہیں سکو گی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو کہ مجرم کی زبان کھلوانے کے لیے ہم کیا کیا طریقے اختیار کرتے ہیں۔ اگر تم اپنی بچت چاہتی ہو تو قانون کے ساتھ تعاون کرو.....اگر میرے ساتھ بھرپور تعاون کرو گی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں خاص رعایت دلواؤں گا۔ بصورت دیگر تم سیدھی جیل جاؤ گی.....اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عدالت تمہیں پھانسی کی سزا سنا دے.....!''

میری اس نفسیاتی دھمکی کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ اچانک پھٹ پڑی مگر بہ انداز دگر!

اس نے میری منت خوشامد کی اور نہ ہی کوئی رعایت حاصل کرنے کے لیے کوئی التجا۔ احتجاجی لہجے میں اس نے کہا۔ ''تھانیدار صاحب! مجھے اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں کہ عدالت اس جرم پر مجھے کیا سزا سناتی ہے۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے جو کچھ کیا، وہ فیصلہ بالکل درست تھا۔ وہ ڈھونگی ملنگ اسی سلوک بلکہ اس سے بھی برے سلوک کا مستحق تھا۔ میں نے تو اسے موت کے گھاٹ اتار کر دکھوں سے نجات دلائی ہے۔''

یہ گویا نصیباں کے جرم کا اقرار تھا۔ میں نے فی الحال اسے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ اس بد بخت نے جسے موت کے منہ میں دھکیلا تھا وہ زندہ سلامت تھا۔ مجھے اس اسٹوری سے بڑی دلچسپی تھی جس کی رُو سے نصیباں نے یہ خطرناک کوشش کی تھی اور یہ دلچسپ اسٹوری میں نصیباں کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔

میں نے رمضان عرف رمضو سے کہا۔ ''تم اپنے گاؤں واپس جا سکتے ہو۔ اب یہاں پر تمہاری ضرورت نہیں۔ چودھری صاحب سے کہنا کہ کام ہو گیا ہے۔ باقی باتیں کل دن میں ہوں گی۔''

میں نے لفظ ''کام'' پر خصوصی زور دیا تھا۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ نصیباں نے اقبال جرم کر لیا ہے۔ اس نے مجھے سلام کیا اور کمرے سے نکل گیا۔ باہر اس کا تانگا موجود تھا لہٰذا رات کی اختتامی گھڑیوں میں رمضو کو تھانے سے صورت نگر تک سفر کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں تھا۔

اس کے بعد میں نے نصیباں کے بھائی غفور احمد کو اپنے کمرے میں بلا لیا تا کہ باقی کی پوچھ گچھ اس کے سامنے ہی ہو۔ ایک مرتبہ پھر میں نصیباں کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

''تم اس بات کا اقرار کرتی ہو کہ ملنگ بابا کو زہریلی کھیر کھلا کر تم نے موت کے گھاٹ اتارا ہے؟''

''ہاں..... میں اقرار کرتی ہوں۔'' وہ بڑی بہادری سے بولی۔

غفور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''نصیباں..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

میں نے غفور کو اسی مقصد سے کمرے کے اندر بلا لیا تھا کہ وہ بھی اپنی بہن کے کارنامے سے واقف ہو جائے۔

''بھائی غفور..... یہ سچ ہے کہ ملنگ بابا کو میں نے ہی قتل کیا ہے۔'' نصیباں نے اٹل لہجے میں کہا۔

''لل..... لیکن..... اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا.....؟'' غفور ہکا بکا رہ گیا تھا۔

''غفور!'' میں نے تنبیہی لہجے میں اسے پکارا۔ ''تھانیدار تم ہو یا میں؟''

''جی.....اب میں بالکل چپ رہوں گا۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

''چپ اختیار کرنا ہی تمہارے لیے مفید ہے غفور۔'' میں نے ڈرانے والے انداز میں کہا۔ ''ورنہ شریکِ جرم ٹھہرا کر میں تمہیں بھی جیل بھجوادوں گا۔''

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے دوبارہ نصیباں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے ملنگ بابا کو کیوں قتل کیا؟''

''وہ مردود اسی لائق تھا!'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے سوال کیا۔ ''ملنگ نے تمہیں ایسا کون سا نقصان پہنچایا تھا جو تم اس کی جان کی دشمن بن گئیں؟''

''نقصان.....!'' وہ تلخی سے بولی۔ ''کوئی ایک نقصان ہو تو بتاؤں۔ اس منحوس نے تو میری زندگی اجاڑ کر رکھ دی تھی۔''

غفور بے یقینی سے اپنی بہن کو دیکھتا چلا گیا۔ میں نے نصیباں سے پوچھا۔

''تفصیل سناؤ.....میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں؟''

''جناب! یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔'' وہ بھائی کی طرف سے نگاہ چراتے ہوئے بولی۔

''میں لمبی چوڑی کہانیاں سننے کا عادی ہوں نصیباں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم غفور کی وجہ سے کچھ کہنے میں ہچکچا رہی ہو تو میں اسے باہر بھیج دیتا ہوں۔''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ بھائی غفور کے سامنے کوئی ہچکچاہٹ یا شرمندگی محسوس ہو۔''

''تو پھر شروع ہو جاؤ۔ میں پوری توجہ سے تمہاری بات سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اور وہ شروع ہو گئی.....!

✠ ✠ ✠

یہ کوئی چار سال پہلے کی بات ہے جب نصیباں لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے گاؤں

صورت نگر میں آ کر آباد نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے گھر، اپنے گاؤں میں رہتی تھی۔ اس کا گاؤں جمال پور ضلع جھنگ میں واقع تھا۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی فرحت کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہی تھی کہ ایک روز سب کچھ بدل کر رہ گیا۔ نصیباں کو پتا چلا کہ فرحت کو گاؤں کے ایک گبرو سے محبت ہو گئی ہے۔ شکیل نامی وہ لڑکا بھی فرحت کو بے پناہ چاہتا تھا۔ جلد ہی ان دونوں کی محبت کے چرچے پورے جمال پور میں پھیل گئے۔

شکیل بڑا سمجھ دار اور لائق لڑکا تھا لہٰذا نصیباں کو فرحت کی محبت پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔ ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیٹی کو سلجھا ہوا شوہر ملے۔ نصیباں بھی یہی چاہتی تھی کہ شکیل اور فرحت کی جلد از جلد شادی ہو جائے۔ دونوں گھروں کی جانب سے رشتے کی بات خاصی آگے بھی بڑھی لیکن باقاعدہ منگنی سے پہلے ایک نیا طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور یہ طوفان جمیل کی وجہ سے آیا تھا۔

جمیل بھی جمال پور ہی کا رہنے والا تھا اور شکیل کا گہرا دوست بھی تھا۔ دونوں میں اتنی مضبوط یاری تھی کہ لوگ ان کی دوستی کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ گاؤں کا بچہ بچہ مانتا تھا کہ دنیا چاہے اِدھر کی اُدھر ہو جائے لیکن شکیل اور جمیل کے تعلقات میں فرق نہیں آ سکتا..... اور طوفان یہ اٹھا تھا کہ ان دونوں کے بیچ فرحت ایک آزمائش کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ اچانک جمیل کو بھی فرحت سے افلاطونی محبت ہو گئی تھی۔

شکیل نے جمیل کو ہر ممکن طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کی بس ایک ہی ضد تھی کہ ہر قیمت پر اسے فرحت چاہیے اور دلچسپ بات یہ تھی کہ فرحت جمیل کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ مطلب یہ کہ جمیل اسے شکیل کے دوست کی حیثیت سے تو قبول تھا لیکن وہ اس سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی محبت کا مرکز و محور صرف اور صرف شکیل ہی تھا۔ فرحت کی شکیل کے لیے دیوانگی کو دیکھ کر جمیل کو بہت غصہ آتا تھا۔ ایک روز اس نے شکایت بھرے انداز میں کہا۔

''یار شکیل! تم دوستی کی خاطر میرا یہ چھوٹا سا کام نہیں کر سکتے؟''

''یار جمیل! میں تو تمہاری خاطر اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔'' شکیل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم کون سے چھوٹے کام کی بات کر رہے ہو؟''

''مجھے تمہاری جان کی نہیں، تمہاری محبوبہ کی جان کی ضرورت ہے۔'' جمیل نے اس کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خود غرضانہ انداز میں کہا۔

''کیا مطلب یار.....؟'' شکیل الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

''مطلب بڑا واضح ہے شکیل۔ شاید تم جانتے بوجھتے ہوئے بھی سمجھنا نہیں چاہتے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں فرحت کو چاہتا ہوں۔''

''لیکن وہ تمہیں نہیں چاہتی۔'' شکیل نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو.....!''

''اگر تم دوستی میں قربانی کے لیے تیار ہو جاؤ تو سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔''

''میں قربانی دینے سے پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں جمیل۔ میں تمہاری دوستی پر دس فرحت نچھاور کر سکتا ہوں۔'' شکیل جذباتی ہو گیا۔ ''لیکن میں دیکھ اور سمجھ رہا ہوں کہ میری یہ قربانی رائگاں جائے گی.....فرحت کے دل میں تمہارے لیے ذرا سی بھی گنجائش نہیں ہے۔''

''قربانی اگر خدا کو حاضر و ناظر جان کر خلوصِ نیت سے کی جائے تو کبھی رائگاں نہیں جاتی۔'' جمیل نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''گویا تم میری نیت پر شک کر رہے ہو؟'' شکیل نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے کبھی تمہاری نیت پر شک نہیں کیا شکیل۔ مجھے تمہاری دوستی پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔'' جمیل نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں محسوس کر رہا ہوں، فرحت ہماری دوستی کے بیچ ایک دراڑ کی طرح پیدا ہو گئی ہے۔ اگر تم نے میرے جذبات کا احساس نہ کیا تو یہ دراڑ ایک روز اتنی بڑھ جائے گی.....''

''بس.....اس سے آگے اور کچھ مت کہنا۔'' شکیل اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''میں تمہاری دوستی کی خاطر فرحت سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔ اب تو خوش ہو نا؟'

''تم میرے سچے دوست ہو شکیل۔'' جمیل نے فرطِ جذبات سے مغلوب لہجے میں کہا۔ ''فرحت سے دستبردار ہونے کے ساتھ تمہیں ایک اور کام بھی کرنا ہو گا۔''

''ہاں بولو.....کون سا کام؟'' شکیل سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

جمیل ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ حقیقت ہے کہ فرحت تمہیں بے انتہا چاہتی ہے اور مجھے ناپسند کرتی ہے۔ تم اسے اس بات کے لیے مجبور کرو گے کہ وہ تمہیں بھول کر مجھے چاہنے

لگے۔ میں جانتا ہوں، وہ تمہاری بات کو حرفِ آخر سمجھتی ہے.....!''

جمیل، فرحت کے حصول کی ضد میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ محبت زبردستی کا سودا نہیں۔ ان لمحات میں وہ خود غرضی کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا لیکن دوسری جانب ایک سچا دوست تھا۔ وہ دوستی کی معراج کو سمجھتا تھا۔ لمحاتی غور و فکر کے بعد اس نے کسی عظیم فاتح کے سے اعتماد کے ساتھ کہا۔

''ٹھیک ہے جمیل! تم بالکل مطمئن ہو جاؤ۔ میں فرحت کو ہر بات اچھی طرح سمجھا دوں گا۔''

شکیل نے اپنے دوست سے جو کہا تھا، وہ آنے والے دنوں میں کر کے اور نبھا کے بھی دکھا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد فرحت اور جمیل کی شادی ہو گئی۔ ایک جانب اگر شکیل نے دوستی میں قربانی دی تھی تو دوسری طرف فرحت نے اپنی محبت میں قربانی دے کر ایک یادگار مثال قائم کر دی تھی لیکن اس عظیم واقعے کا نتیجہ بڑا سنگین برآمد ہوا۔

شادی کے ایک ہفتے کے بعد فرحت کو بڑا خوف ناک بخار چڑھا اور وہ چوبیس گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد چل بسی۔

فرحت کی موت نے شکیل کا دماغ الٹ دیا اور وہ دیوانوں کی طرح پورے گاؤں میں چکراتا پھرنے لگا پھر ایک روز وہ اچانک جمال پور سے غائب ہو گیا۔ اس کے بارے میں کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ نصیباں کی تو جیسے دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ اس کی زندگی فرحت کے گرد گھومتی تھی۔ جب زندگی کا مرکز اور محور ہی باقی نہ رہے تو کوئی کب تک مدار میں زندہ رہ سکتا ہے۔ وہ بھی شدید بیمار پڑ گئی۔

جمال پور میں نصیباں کا کوئی قریبی عزیز رشتے دار نہیں تھا لہٰذا غفورا اسے اپنے ساتھ صورت نگر لے آیا۔ پچھلے تین سال سے وہ اپنے بھائی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ حالات چاہے کسی بھی انداز میں پیش آئے ہوں لیکن وہ اپنی تباہی و بربادی کا ذمے دار صرف اور صرف شکیل ہی کو سمجھتی تھی۔ جس انسان کا ہنستا مسکراتا چمن اجڑ جائے وہ دوسروں کی قربانی اور ایثار کو سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے اسی لیے جب کئی سال کے بعد نصیباں نے شکیل کو ملنگ بابا کے روپ میں، صورت نگر کے باہر پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھے دیکھا تو اسے اپنے انتقامی جذبات پر اختیار نہ رہا.....!

شکیل نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنی دیوانگی میں نگری نگری پھرتا ہوا اتفاق سے ایک ایسے گاؤں

میں آ گیا ہے جہاں بسنے والے انسانوں میں سے ایک انسان کے دل میں اس کے لیے شدید نفرت ہے۔ اتنے عرصے میں شکیل کا رنگ روپ اور حلیہ بالکل بدل کر رہ گیا تھا لیکن اس انداز میں بھی نصیباں نے اسے پہچان لیا تھا۔ اگر شکیل کو اپنے ماحول اور گردونواح کا احساس ہوتا تو وہ بھی یقیناً نصیباں کو پہچان لیتا لیکن وہ ملنگ بننے کے بعد اپنے آپ سے بے گانہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ نصیباں کی لائی ہوئی سویٹ ڈش بڑے مزے سے کھاتا رہا اور ایک روز نصیباں نے اپنی منصوبہ بندی کے عین مطابق، زہریلی کھیر اس کے معدے میں اتار دی۔

''وہ شیطان میری فرحت کا قاتل تھا!'' نصیباں نے اپنی بات کے اختتام پر جوش بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے اسے زہر دے کر ایک نیک کام کیا ہے۔ اگر وہ فرحت کو جمیل سے شادی کرنے پر مجبور نہ کرتا تو آج میری فرحت زندہ ہوتی۔ آپ اس جرم میں مجھے پھانسی بھی لگا دیں تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ میں بڑے سکون سے مروں گی کہ میں نے اپنی فرحت کا انتقام لے لیا ہے۔''

''تم زندہ رہو گی نصیباں!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ تمہیں پھانسی نہیں دی جا رہی.....!''

''جی.....کیا طلب.....؟'' وہ حیرت بھری بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔

''مطلب یہ کہ تم ملنگ بابا کی قاتل نہیں ہو.....!''

''پھر.....پھر اس شیطان کو کس نے مارا ہے؟'' اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔

''کسی نے بھی نہیں۔'' میں نے بایا۔ ''اور وہ شیطان نہیں بلکہ بہت عظیم انسان ہے، تمہاری اطلاع کے لیے بتاتا چلوں کہ ملنگ بابا کو ڈاکٹروں نے بچا لیا ہے۔ وہ زندہ ہے.....!''

نصیباں کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''یہ.....یہ آپ.....کیا کہہ رہے ہیں.....؟''

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں نصیباں کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا اور آخر میں کہا۔

''نصیباں! جن لوگوں میں قربانی کا جذبہ ہوتا ہے وہ زندگی کے کسی محاذ پر شکست نہیں کھاتے۔ شکیل نے اپنی دوستی میں جو کچھ بھی کیا وہ بظاہر انتہائی بے ہودہ اور غلط لگتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ دوستی کے مفہوم سے اچھی طرح آگاہ تھا اور تمہاری بیٹی فرحت بھی محبت کی حقانیت کا

ادراک رکھتی تھی۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ.....اب وہ دونوں بڑی اچھی جگہ پر ہیں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری فرحت اُس دنیا میں خوش رہے تو ملنگ بابا (شکیل) کی طرف سے اپنا دل صاف کرلو۔ میں نے ملنگ بابا کے بارے میں جتنا کچھ سنا ہے اس سے میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اللہ اس بندے سے بہت خوش ہے جب ہی اس کی ذاتِ پاک نے اس کی زبان اور دعا میں تاثیر پیدا کردی ہے۔ قربانی کا صلہ خدا ہی دے سکتا ہے۔''

نصیباں اور اس کا بڑا بھائی آنکھیں پھاڑ کر اس طرح مجھے دیکھنے لگے جیسے میں کوئی تھانہ انچارج نہیں، بلکہ کوئی دینی مبلغ ہوں۔